تعارف

اس کتاب میں اُن مختلف موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے جن کا واسطہ ہمیں روزمرہ زندگی میں پڑتا رہتا ہے۔اس ضمن میں کئی طرح کے مسائل ومشکلات کی نشاندہی کر کے ان کے حل کی کوشش کی گئی ہے۔ان بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں پر عمل کرنے سے کوئی بھی فرد یا خاندان اپنی زندگی کو خوبصورت، فعال وخوشحال اور خوشگوار بنا کر معاشرے میں باعزت اور باوقار مقام حاصل کرسکتا ہے۔اس مقصد کے حصول کیلئے کچھ اہم نکات کو مدنظر رکھیں تو گھمبیر مسائل حل کرنے میں کافی مدد ملے گی اور زندگی میں آسانیاں بھی ہونگی۔مثلاً یہ کہ جو بھی کام کریں،قدم اُٹھائیں،اخراجات یا لین دین کریں وہ **ضرورت** کے مطابق یعنی ترجیحی بنیادوں پر کریں، وقت کی قدر کریں اور ضیاع واصراف سے بچیں گے تو محدود آمدنی میں بھی کامیاب اور خوشحال زندگی کا حصول ممکن ہوگا۔**انشاءاللہ**

ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایک باعزت،خوشحال،صحت منداور کامیاب زندگی گزارے۔ اس کے لئے وہ اپنی انتہائی صلاحیت اور فہم وفراست کے مطابق کوشش بھی کرتا ہے۔اس ضمن میں اگر بظاہر معمولی مگر نہایت موثر طریقوں اور رویوں کو اپنی عادات میں شامل کرلے تو وہ نہ صرف کامیاب بلکہ خوبصورت اور باوقار زندگی گزار سکتا ہے۔جس کے لئے ہمیں کچھ اہم بنیادی نکات کو اپنانا ہوگا جن میں اخلاقیات، ڈسپلن،ٹائمنگ، پلاننگ،ضروریات اور برداشت سے ہمیں روزمرہ کے معاملات ومسائل کو احسن طریقے سے حل کرنے میں مدد ملے گی۔

اخلاقی تقاضے:

اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ زور اخلاق پر دیا ہے کیونکہ یہ ایسا موثر ذریعہ ہے جس سے انسانی زندگی نہایت خوبصورت و پرکشش اور باوقار ہو جاتی ہے۔ اخلاق کے عام معنی و مفہوم تو سب ہی جانتے ہیں مگر بعض ایسے رویے اور جملے ہم دوران گفتگو ادا کر جاتے ہیں جو بظاہر معمولی لیکن تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ وہ بھی بد اخلاقی اور بے ادبی کے زمرے میں آتے ہیں۔ دوسروں سے گفتگو کرتے ہوئے ہمیں اس بات کا ادراک ہونا چاہئے کہ ہمارے کسی لفظ، جملے یا انداز سے سامنے والے کی تضحیک یا سبکی تو نہیں ہو رہی۔ مثلاً کسی کو دیکھتے ہی کہہ دینا یہ کیا پہنا ہوا ہے یا یہ رنگ تم پر جچ نہیں رہا۔ اسی طرح راستے میں چلتے ہوئے کئی طرح کے تبصرے سننے پڑتے ہیں یعنی تمہارے بال کیوں بکھرے ہوئے ہیں یا چہرہ کیوں اُترا ہوا ہے یا اتنی سردی تو نہیں کہ کوٹ یا سویٹر پہنا ہوا ہے۔ یا گرمی میں اتنے موٹے کپڑے کیسے پہن رکھے ہیں یا لڑکا پاس ہوا ہے تو نمبر کتنے ہیں۔ اگر 80% ہیں تو فلاں کے بچے نے تو 90% نمبر لئے ہیں۔ ابھی فارغ ہے جاب نہیں لگی۔ یا بچی کا رشتہ ہوا ہے اگر ہاں کہیں تو شادی کب ہوگی۔ شادی کو ایک دو سال گزر جائیں تو ابھی بچہ نہیں ہوا۔ یا بیرون ملک جانا ہو تو ابھی ویزہ نہیں لگا فلاں کا تو بہت جلدی لگ گیا تھا یا کافی دنوں سے میکے میں ہے سسرال سے جھگڑا تو نہیں ہو گیا۔

آج پیدل چل رہے ہو گاڑی کہاں ہے؟ کچھ خریدا ہو تو کہتے ہیں مہنگا خرید لیا ہے۔ بیچا ہو تو سستا بیچ دیا ہے ہمیں بتانا تھا اگر پہلے بتا دیا جائے تو جواب ملتا ہے کہ تھوڑی دیر پہلے آ جاتے تو مطلوبہ چیز تھی ابھی کوئی لے گیا ہے۔ اس طرح سے چبھتے اور ناپسندیدہ جملے بھی بد اخلاقی کے زمرے میں آتے ہیں۔ اسی طرح گھر میں ٹی وی دیکھتے ہوئے کسی اداکار، کھلاڑی یا سیاستدان کی تعریف کی جائے تو پاس بیٹھا ہوا اس کی پسند یا رائے کو مسترد کر کے یہ کہتے ہوئے اس کا ٹھٹھا بھی بنائے آپکی

یہ پسند ہے چاہے وہ اس کا باپ یا کوئی دوسرا بزرگ ہی ہو۔اسی طرح کسی بڑے کے کمرے میں داخل ہونے پر احتراماً کھڑا ہونا یا اس کو جگہ دینا تو دور کی بات اس کی موجودگی کا احساس تک نہ کرنا یا کسی کام کیلئے آواز دینے پر کان نہ دھرنا۔

نہ صرف چھوٹوں بلکہ بڑوں کی بھی چاہیے کہ بچوں کے احساسات کا خیال رکھیں ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر طریقے سے سمجھائیں اور کامیابیوں پر داد وتحسین کریں۔اس طرح بچوں کا اعتماد بحال ہوگا اور وہ آئندہ زندگی کے نشیب وفراز سے احسن طریقے سے عہدہ برآ ہوں گے اور ان کے دل میں بزرگوں اور والدین کی عزت واحترام میں بھی اضافہ ہوگا۔یہ ان عمومی رویوں کی چند مثالیں ہیں جنکا ہمیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم کسی کا دل دکھا رہے ہیں یا توہین کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس ہم مثبت سوچ اور پرخلوص جذبوں سے دوسروں کے دل جیتنے میں کامیاب ہو جائیں تو یقین جانیے اس سے بڑی نیکی کوئی نہیں ہے۔مثال کے طور پر اگر کوئی تیار ہو کر سامنے آئے تو اس کے پوچھنے یا داد طلب نظروں سے دیکھنے سے پہلے ہی تعریف کریں خواہ آپ کو سامنے والے کا لباس پسند نہ بھی ہو یا کوئی اپنی بیماری کا ذکر کرے تو اسے مایوس کرنے کی بجائے تسلی دیں کہ یہ کوئی خاص بیماری نہیں جلد ٹھیک ہو جائیں گے جیسے اس مرض میں مبتلا مریض شفا یاب ہو چکے ہیں اور یہ کہ آپ چہرے سے تو بیمار نہیں بلکہ فریش لگ رہے ہیں اس طرح کے دلکش اور شیریں جملوں سے ہم دوسروں کی مایوسی اور نا اُمیدی کو اُمید میں بدل کر معاشرے میں صحت مند رجحانات کو فروغ دینے کے عظیم مقاصد کو حاصل کر لیتے ہیں۔

والدین سے برتاؤ:

اس خوبصورت اور محترم رشتے کے حقوق وفرائض اور اخلاقیات کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ ماں کے قدموں میں جنت اور باپ جنت کا اعلیٰ دروازہ ہے۔ان کی خدمت وفرمانبرداری

اورضروریات کا خیال رکھنے کے علاوہ والدین کی رائے اور پسندوناپسندیدگی کا احترام کرنا اصل کمال ہے۔عمروں میں فرق اورزمانے کے تغیروتبدل کی وجہ سے سوچ اورخیالات میں تضاد عام سی بات ہے کسی مسئلہ یامعاملہ میں اختلاف رائے کی صورت میں بحث وتکرار کے دوران ان کے رتبےاورمقام کا خیال رکھتے ہوئے اپنے جذبات اورغصہ کوکنٹرول اوران کی کڑوی کسیلی باتوں کو برداشت کرنے سےہی ادب واحترام اوراخلاقی تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ برابری کی بنیاد پرتو ہم ہرکسی سے گزارا کرلیتے ہیں حتیٰ کے گھر میں پالتو جانور بھی ہمیں تنگ نہیں کرے گا تو ہم بھی اسے کچھ نہیں کہیں گے۔ یہ تو کوئی کمال نہیں بلکہ کمال تو یہ ہے کہ ہمیں دوسروں بالخصوص والدین کی بات غلط بھی لگے تو برداشت کریں۔ یہ مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں کیونکہ دنیاوی فائدے اورخوف کی وجہ سے تو ہم اس سے بڑھ کربھی برداشت کا مظاہرہ کرلیتے ہیں۔مثلاً ملازمت کی صورت میں افسران کی بے جا ڈانٹ ڈپٹ اورغضب یا ایسے کسٹمرجن کی ناراضگی سے مالی یا کیریئر کےنقصان کا اندیشہ ہو،ان کی کڑوی کسیلی اورغیراخلاقی باتوں پرضبط کرلیتے ہیں تو دنیاو آخرت میں ہمیشہ رہنے والے اجروثواب اور فائدے کیلئے والدین کی نصیحت اورسبق آموز تلخ حقیقت پرمبنی اصلاحی باتیں برداشت کیوں نہیں ہوسکتیں جبکہ ہم اس حقیقت کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ والدین سے زیادہ ہمارا کوئی خیرخواہ نہیں۔

رشتہ دار:

ہمارے مذہب میں رشتے داروں سے حسن سلوک پر بہت زور دیا گیا ہے۔خاص کرغریب رشتہ دارجن کونظرانداز کرکے ان کی عزت نفس کومجروح کیا جاتا ہے۔جبکہ وہ ہمیشہ امیر رشتہ داروں کی توجہ کے منتظر رہتے ہیں۔ بالخصوص تقریبات وغیرہ میں میزبانوں کوان کی شرکت کا احساس تک نہیں ہوتا۔یعنی نہ آنے کی خوشی نہ جانے کا غم۔بیچارے خود ہی تقریب میں شریک ہوکر چلے

جاتے ہیں۔تکلفاً بھی رکنے پر اصرار نہیں کیا جاتا۔شادی کے موقع پر خود ہی فوراً گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں کیونکہ اُن کو خطرہ ہوتا ہے کہ اُن کی غیر موجودگی کی پرواہ کیے بغیر چھوڑ کر ہی نہ چلے جائیں۔یقین جانئے تھوڑی سے توجہ یعنی کسی بچے یا ملازم کو ہی اٹھا کر انہیں جگہ دے دی جائے تو ان کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ بعد میں اپنے گھر یا ملنے والوں سے اس عزت افزائی کا ذکر فخریہ انداز میں کرتے ہوئے جو دعائیں دیتے ہیں اس سے بڑی نیکی اور خدا کی خوشنودی کا کوئی ذریعہ نہیں کیونکہ انسانی تخلیق کا مقصد ہی درد دل اور احساس مندی ہے۔

مہمان اور میزبان کی اخلاقی ذمہ داریاں:

مذہبی، معاشرتی اور اخلاقی طور پر مہمان کی عزت و توقیر اور احترام ہم پر واجب ہے۔ پر جوش استقبال اور عزت افزائی سے مہمانوں کی ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔مہمانوں کے احترام کو ملحوظ رکھنے کے لئے چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھیں۔یعنی ان کو اکیلا نہ چھوڑیں،حسب توفیق خاطر مدارت کریں، جانے کا ارادہ کریں تو رکنے پر اصرار کریں، چائے وغیرہ پی لی ہے تو کھانے کے لئے روکیں،کھانا کھائیں تو مہمان کے بعد ختم کریں کیونکہ پہلے کھانا ختم کریں گے تو لامحالہ مہمان بھی ہاتھ روک لے گا جو مناسب نہیں۔ جاتے وقت دروازے تک چھوڑنے جائیں اور دوبارہ آنے کا کہہ کر رخصت کریں۔ اسی طرح کچھ ذمہ داریاں مہمانوں کی بھی ہیں آغاز مہذب طریقے سے کریں یعنی دروازے پر لگی گھنٹی کو زور سے نہ دبائیں نہ ہی بار بار بجائیں کیونکہ گیٹ یا دروازے پر تو کوئی نہیں بیٹھا ہوتا کہ فوراً ہی کھول دے۔گھر داخل ہوتے ہی نقص نہ نکالیں کہ پینٹ پرانا ہو گیا ہے یا پردے کافی میلے ہیں خوامخواہ دوسرے کمروں میں نہ جائیں، نہ جھانکیں۔ بچے ساتھ ہوں تو کنٹرول کریں کہ اودھم نہ مچائیں اس طرح نقصاں کا بھی احتمال ہوتا ہے۔ کھانے میں نقص نہ نکالیں ایسی کوئی بات یا عمل نہ کریں جس سے میزبان کی خوشی پریشانی اور

بیزارگی میں بدل جائے۔ ماحول میں ایسی بدمزگی مہمان کے لئے بھی باعث شرمندگی وندامت ہوگی ۔ ماحول کو خوشگوار اور پرسکون رکھنا فریقین کی ذمہ داری ہے ایسی بات نہ کی جائے جو دوسرے چھپانا چاہیں، یعنی گفتگو میں تفتیش کا انداز نہ ہو۔ رشتے نبھانے اوران کو مضبوط کرنے کے لئے ایک دوسرے سے ملنا ملانا ضروری ہے، یہ جبھی ممکن ہے جب فریقین ایک دوسرے کا احترام کریں اور ایسا رویہ نہ اپنائیں کہ ملاقات کی اصل روح یعنی خوشی وسرشاری ناگواری میں بدل جائے۔

ہمسائے کی اہمیت و ضرورت:

ہمسایوں کے ساتھ اچھا سلوک اور پرخلوص تعلقات، رشتہ داروں سے بھی زیادہ اہم اور مذہبی و معاشرتی تقاضے بھی ہیں کیونکہ ہمہ وقت ایک دوسرے کی ضرورت بھی ہیں اس لئے باہمی عزت و احترام سے ایک فیملی کی طرح رہنا چاہیے ضرورت اور استعمال کی چیزیں خوش دلی سے ایک دوسرے کو دیں۔ خاص ڈش بنائیں تو ضرور بھیجیں۔ گھر کے لان وغیرہ میں اگنے والے فروٹ یا سبزی کے علاوہ گاہے گاہے تحفے تحائف بھی بھیجیں ویسے بھی درختوں، پودوں میں لگے رہنے سے خراب ہونے یا اس کے علاوہ زیادہ کھانا بننے کی صورت میں ضائع ہونے سے بہتر ہے کسی کے کام بھی آئیں اور باہمی محبت کے ساتھ ثواب بھی حاصل کریں۔

خوشی غمی میں گھر کا کچھ حصہ مختص کرنے کی آفر کریں بالخصوص فوتگی پر چائے وکھانے کا اہتمام کریں اور روایات کے مطابق دکھ کی اس گھڑی میں سہولت دینے کی کوشش کریں۔ اس طرح حسب موقع ایک دوسرے کی ضروریات اور احساسات کو مدنظر رکھیں گے تو فریقین کی قدر ومنزلت میں جو اضافہ ہوگا اس کے اثرات پورے معاشرے میں مرتب ہونگے۔ اچھے اور پرخلوص ہمسائے مل جائیں تو زندگی خوشگوار اور پرسکون ہو جاتی ہے ایسے ہمسائے خدا کی نعمت ہیں جن کی قدر کرنے

میں بالآخر ہماری اپنی ہی بھلائی اور عافیت ہے۔

گھر کا ماحول :

باہمی احترام ایک دوسرے کی ضروریات واحساسات، ذمہ داری و برداشت اور سلیقہ مندی کو ملحوظ رکھ کر ہی گھر راحت اور امن وسکون کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ ایسے مثالی خاندان کے تصور کو حقیقت میں بدلنا کچھ مشکل نہیں صرف چند چھوٹی چھوٹی مگر موثر باتوں کا خیال رکھنا اور عادات بنا کر ہم ایسا باوقار اور بااعتماد ماحول پیدا کر سکتے ہیں جس میں زیادہ اہم کردار خاتون خانہ کا ہے۔ مثلاً خاوند کے کام پر اور بچوں کے سکول وکالجز میں جانے کے حساب سے بروقت ناشتہ وتیاری ہوگی تو مسئلہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح واپسی پر حسب ضرورت کھانا یا چائے کا موقع کے مطابق اہتمام ۔یعنی بچوں کے ٹیویشن یا کھیلنے یا مرد نماز کیلئے مسجد جانے لگیں تو چائے وغیرہ پیش کرنے سے انہیں مشکور ہونے کی بجائے برا ہی لگے گا۔ یعنی صحیح اوقات کا خیال نہ کرنے سے یہ خدمت بھی بدمزگی میں بدل جائے گی۔ کھانا جو بھی بنے بس صفائی اور ذائقے کا خیال ہو اور سب کو اکٹھے بیٹھ کر کھانا چاہیئے ۔اس طرح برکت اور بچت کے ساتھ ساتھ خاتونِ خانہ کو راحت وآرام بھی ملے گا۔ ایک دو افراد بعد میں کھائیں گے تو دوبارہ زحمت کرنا پڑے گی جو مردوں کی طرف سے زیادتی بھی ہے۔ بار بار گرم کرنے سے غذائیت بھی کم ہو جاتی ہے اور گیس، بجلی وغیرہ کا خرچ بھی بڑھ جاتا ہے۔ کھانے کے بعد استعمال شدہ برتن فوراً اُٹھائیں۔ بکھرے برتن بُرے بھی لگتے ہیں اور گندگی کا احساس ہونے سے دوسروں کو کہنا پڑے تو عورتوں کو بُرا لگتا ہے۔ ایسے چھوٹے چھوٹے کام مرد بھی کر لیں تو ایک دوسرے میں احساس کا جذبہ اُجاگر ہونے سے ماحول میں مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کسی بچے کو کوئی کام کہیں تو اس کے انکار پر دوسرے بچے کو فوراً وہی کام کہیں گے تو دونوں کی شخصیت پر منفی اثرات ہونگے۔ ایک خودسر، ڈھیٹ یا بدتمیز جبکہ دوسرا ذہنی دباؤ کا شکار

ہوکر چڑچڑا اور ضرورت سے زیادہ حساس ہوسکتا ہے۔اس لئے بچوں کی تربیت اس نہج پر کریں کہ کوئی خود کو برتر یا کمتر نہ سمجھے۔اس طرح بچے پر اعتماد باصلاحیت اور مثبت سوچ کے حامل ہونگے جس سے گھر کا ماحول بھی مہذب اور دوستانہ ہوگا۔نقصان و لا پرواہی یا پڑھائی کے سلسلے میں والدین سمجھائیں یا ڈانٹ بھی دیں تو بچوں کو بُرا ماننے کی بجائے سمجھنا چاہیے اور والدین کو بھی ادراک ہونا چاہیئے کہ بچے تو آخر بچے ہوتے ہیں بڑوں جیسی سوجھ بوجھ نہیں ہوسکتی پھر بھی کسی فرد بالخصوص والد یا خاوند کو غصہ آجائے تو بیوی یا بچے مقابلہ کرنے کی بجائے خاموش ہو جائیں تو وہ بھی زیادہ نہیں بھڑکے گا بلکہ ندامت محسوس کر کے احساس کرے گا اس طرح معمولی غلطیوں کو نظر انداز اور قابل تعریف عمل کو سراہنے سے مثبت ماحول پروان چڑھے گا۔

اعتدال :

حدیث رسول ﷺ ہے کہ میانہ رو کبھی محتاج نہیں ہوگا۔ ہمارے معاشرے کی اصل شکل متوسط طبقہ ہے کیونکہ بالائی کلاس ان کو اور یہ نچلی کلاس کو اہمیت نہیں دیتے۔اس لیے دونوں کی اجتناب برتنے کی کوشش اور خواہش مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوتی۔ چنانچہ طبقاتی فرق کم ہونے کی وجہ سے مڈل کلاس کا دونوں سے واسطہ پڑتا ہے اَپر کلاس کے زیادہ مالی مسائل تو ہوتے نہیں جبکہ نچلا طبقہ غربت تسلیم کر کے نہ صرف مدد لے بھی لیتا ہے بلکہ زکوٰۃ و خیرات کے لئے درخواست بھی کرتے ہیں۔اس طرح ان کے مالی مسائل دوسروں کے ذمے ہونے کی وجہ سے کسی نہ کسی طرح حل ہو ہی جاتے ہیں۔ اسی لئے زیادہ بچے پیدا ہونے پر ان کو فکر کی بجائے سپورٹ ہو جاتی ہے۔ سرکاری ہسپتال یا گھر میں پیدائش کی صورت میں دایہ وغیرہ کو بھی زیادہ اجرت کی امید نہیں ہوتی بچہ دودھ ماں کا پی لیتا ہے اور کپڑے بڑے بہن بھائیوں کے پہن لیتا ہے اور سنبھال بھی بڑی بہنیں لیتی ہیں۔سکول جائے بھی تو دو چار جماعتیں پڑھ کر آٹھ دس سال کی عمر میں کسی دوکان یا

مکینک کے پاس کام کرنے سے اُلٹا کمانے لگتا ہے۔ بچیاں بھی گھروں میں کام یا سلائی وغیرہ کر کے ہاتھ بٹاتی ہیں۔ شادی کے موقع پر رشتہ دار اور محلّہ دار مدد کو تیار ہوتے ہیں گویا انا اور خودداری کے مشکل راستے کی بجائے انہوں نے خوشامد اور عاجزی میں ہی عافیت سمجھی ہے۔

سب سے زیادہ مسائل کا سامنا متوسط طبقے کو کرنا پڑتا ہے کیونکہ انہیں سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لئے بہت پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ چنانچہ ضرورت اور چاہنے کے باوجود دوسروں سے سوال کرنا یا مدد لینا وہ اپنی خودی اور وقار کے خلاف سمجھتے ہیں اس لئے انہیں مالی مسائل سے نبرد آزما ہونے کیلئے حکمت اور پلاننگ سے ایسے مئوثر اقدامات کرنے چاہیں جن سے وہ اپنا قائم کردہ معیار برقرار رکھ سکیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ فرد واحد پر بوجھ ڈالنے کی بجائے خواتین بھی طور طریقے اور احتیاطی تدابیر سے وسائل پیدا کرنے کے لئے اپنا کردار ادا کریں۔ اگر ملازمت کر سکیں تو ٹھیک ورنہ گھر رہ کر بھی آمدنی کے ذرائع پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً اگر خواتین پڑھی لکھی ہوں تو بچوں کو باہر سے ٹیویشن کی بجائے گھر پر ہی پڑھا سکتی ہیں۔ یا دوسروں کے نہیں تو کم از کم اپنے کپڑوں کی سلائی خود کر سکتی ہیں۔ اسی طرح بیوٹیشن کی بجائے خود مہارت حاصل کریں تو چھوٹی موٹی تقریبات میں اپنا بناؤ سنگھار خود کر کے یہ خرچے بچائے جا سکتے ہیں۔ گرمیاں شروع ہوتے ہی بالخصوص خواتین لون وغیرہ کے کئی کئی سوٹ یوں خرید لیتی ہیں جیسے پچھلے موسم گرما کا ان کے پاس کوئی لباس ہی نہیں حالانکہ 5 یا 6 مہینے پہلے وہ قابل استعمال ہی تھے اسی طرح کھانا بھی حسب ضرورت بنانے کی سوجھ بوجھ ہونی چاہیے۔ پھر بھی بچ جائے تو فریج میں رکھ کر اگلے دن تک استعمال ہو سکتا ہے۔ چائے کم بھی بن جائے تو حرج نہیں یعنی اگر چار کپ بنانے پر اگر کوئی پانچواں آ گیا ہے تو پریشان نہ ہوں بلکہ لبالب بھرنے کی بجائے ذرا کم ڈال کر پانچ کپ بھی بن سکتے ہیں۔ کونسا کھانا ہے جو پیٹ بھرنا ضروری ہے۔ اسی طرح کولڈ ڈرنک مہمانوں کے سامنے

گلاسوں میں ڈالیں۔ ہوسکتا ہے بیماری یا پرہیز کی وجہ سے وہ نہ لیں تو ضائع ہونے سے بچ جائے اسی طرح بجلی، گیس اور فون کا بل کنٹرول کرنے کے لیے میٹر پر نظر رکھیں۔ ایسے آلات بالخصوص استری، موٹر، اوون، اے سی، ہیٹر، گیزر وغیرہ کو طریقے سے استعمال کریں۔ مثلاً پوری رات کی بجائے 2 یا 3 گھنٹے ایئر کنڈیشنڈ آن رہے تو سخت ٹھنڈ کی وجہ سے کمبل لینے سے بہتر ہے کہ آف کر کے پنکھا آن رکھیں تو اگلے اتنی ہی ٹائم تک ضرورت نہیں پڑتی۔ حبس ہو جائے تو پھر آن کر لیں اسی طرح کھانا وغیرہ گرم کرنے کے لیے اوون کی بجائے گیس کا استعمال کریں۔ روز روز کی بجائے واشنگ مشین ایک دو ہفتے بعد یا فیملی کے سائز کے حساب سے لگائیں۔ اس طرح بجلی کے ساتھ ساتھ سرف وصابن بھی بچے گا۔ ایک وقت میں ہیوی بجلی والے آلات کم سے کم آن کریں۔ رات کی نسبت دن کو بجلی استعمال کرنے سے شمسی توانائی کی مدد سے بجلی کم خرچ ہوتی ہے، صبح اٹھتے ہی کھڑکیوں وغیرہ کے پردے ہٹا دیں اور اگر سردی کا موسم نہیں تو کھڑکیاں بھی کھول دیں تا کہ تازہ ہوا سے مستفید ہو سکیں۔ بلب وغیرہ آف کر دیں تا کہ سورج کی روشنی سے فائدہ اُٹھا کر بجلی کی بچت کر سکیں۔ ایک آدھ کام کے لئے بار بار مارکیٹ یا بازار جانے کی بجائے دو چار کام اکٹھے ہو جائیں تو ایک ہی بار گاڑی نکالیں، خریداری کے علاوہ کسی دفتر، ہسپتال یا ملنے ملانے کا پروگرام ترتیب دینے سے قیمتی وقت اور پیسہ بھی بچے گا۔ نہ صرف تنگدستی بلکہ خوشحالی میں بھی اعتدال کا حکم ہے۔

امیر کلاس کو دوسروں کی تنقید کی پرواہ کم ہی ہوتی ہے اس لیے وہ جو چاہیں کریں ان کا انداز یا سٹائل ہی کہلائے گا۔ شادی بیاہ کے موقع پر وہ کم لوگوں کو بلائیں یا جہیز نہ بھی دیں عام سے ہوٹلوں میں تقریب رکھیں ان کی ساکھ برقرار ہی رہتی ہے۔ جبکہ متوسط طبقے والے ناک اونچی رکھنے اور دوسروں کو مرعوب کرنے کیلئے حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرنے سے مقروض بھی ہو جاتے ہیں۔

یہ نچلے طبقے کی طرح مالی مدد تو نہیں مانگتے لیکن حیثیت سے بڑھ کر معیار برقرار رکھنے کی وجہ سے ادھار مانگنا انکا معمول بن جاتا ہے اسی طرح عیدین پر بھی دو تین کی بجائے ایک سوٹ پر اکتفا کی ترغیب دینی چاہیے۔ اگر چہ نیا لباس پہننا سنت ہے لیکن فضول خرچی بھی تو خلاف سنت ہے۔ رمضان میں اخراجات میں کمی کے موقع سے فائدہ اُٹھانے کی بجائے ہم معمول سے بھی زیادہ تعیش کرتے ہیں۔ حسب ضرورت خرچ ضرور کریں مگر ضائع نہ کریں۔ اس طرح احتیاط، حکمت اور مثبت سوچ سے ہم مالی معاملات میں توازن پیدا کر کے گھمبیر مسائل سے کافی حد تک چھٹکارہ پا سکتے ہیں یعنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلانا اور سگھڑ پن ہی اس طبقے کے مسائل کا حل ہے۔ جہاں معمول کے اخراجات پر بھی قابو پانا محال ہوتا ہے وہاں شوق اور دوسروں پر دھاک بٹھانے کے چکر میں بچوں کو اعلیٰ، نامور اور مہنگے تعلیمی اداروں میں داخل کروا کر ایک نئے امتحان میں ڈال لیا جاتا ہے بقول منیر نیازی

''اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو میں ایک دریا کے پار اُترا تو میں نے دیکھا''

ابھی ایک گرداب سے نکلے نہیں تو لامحالہ باقی بچوں کے لیے بھی وہی سلسلہ برقرار رکھنا تقریباً نا ممکن ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً حالات کنٹرول سے باہر ہونے کی وجہ سے گھریلو جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں اور سب ایک دوسرے کو اس دلدل میں پھنسنے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ فطرتاً ماں کو بچوں کی سپورٹ ہوتی ہے جس بنا پر وہ خاوند سے وہ انہونے تقاضے کرتی ہے جن خدشات کا اظہار وہ پہلے ہی کر چکا ہوتا ہے کہ پاؤں چادر سے باہر پھیلانے میں بربادی ہے۔ یہ بات صحیح ثابت ہونے کے باوجود فراخدلی سے اعتراف کر کے اصلاح کرنے کی بجائے تنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ باور کروا کے مزید بوجھ ڈالنے پر اصرار کیا جاتا ہے کہ یہ تو والد کی ذمہ داری ہے۔ جان بوجھ کر اس حقیقت سے انحراف کیا جاتا ہے کہ فرائض اور مالی ذمہ داریاں آمدن کے مطابق ہوتی

ہیں جبکہ محدود آمدنی میں لامحدود تقاضے کر کے ناجائز ذرائع پر مجبور کرنے نہ نامذہب، نہ معاشرہ اور نہ ہی رزق حلال کمانے والا برداشت کرتا ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ باقی تمام معاملات سمیت مالی معاملات میں توازن برقرار رکھا جائے تا کہ ایک پروقار، با اعتماد اور مہذب خاندان پروان چڑھے۔ ورنہ معاشی عدم توازن کی وجہ سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے جس سے تلخیاں بڑھ کر لڑائی جھگڑوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ان جھگڑوں کی وجہ سے رشتوں کا احترام ختم ہو جاتا ہے اور نفرتیں جنم لیتی ہیں۔ ایک دوسرے سے شاکی رہنے کی وجہ سے یکجہتی برقرار نہیں رہتی اور بھرے پُرے خاندان کے افراد اپنے آپ کو تنہا سمجھنے لگتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ذہنی اور جسمانی بیماریاں گھر کر لیتی ہیں۔ اب آپ نے فیصلہ کرنا ہے کہ توازن کا راستہ اختیار کر کے باوقار، باعزت، مہذب اور پرسکون ماحول کا حصول ممکن بنانا ہے یا لامحدود تشنہ آرزوؤں کے پیچھے بھاگ کر لاحاصل خواہشوں، تمناؤں کی گہری کھائی میں گرنا ہے۔

زندگی ڈھنگ سے گزاریئے:

روزمرہ کے معاملات میں کئی طرح کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جن میں مردوں کے کاروبار یا ملازمت سے لے کر عورتوں کے گھریلوں کام، بازاروں اور بچوں کے تعلیمی اداروں میں جانے کے علاوہ مہمانداری، خوشی غمی میں شرکت سمیت کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں اگر سوچ بچار اور پلاننگ کر لی جائے تو نہ صرف وقت اور پیسہ بچا سکتے ہیں بلکہ تندرست اور مطمئن بھی رہ سکتے ہیں۔ مردوں نے اگر بازار یا کہیں بھی جانا ہو تو کوشش کریں کہ دفتر یا دکان سے آتے جاتے نپٹا لیں اس طرح نہ صرف وقت اور پٹرول بچے گا بلکہ گھر آ کر دوبارہ نکلنے کی مشکل سے جان بچ جاتی ہے۔ یعنی گھر میں مصروفیت و گپ شپ یا پسندیدہ ٹی وی پروگرام میں مگن ہو کر موڈ ہی نہ بنے اسی طرح عورتیں بھی روز روز باہر نکلنے کی بجائے کچھ دن گزار کر جائیں اور کاموں کو

ترتیب دے لیں۔ مثلاً اگر ڈاکٹر یا بچوں کے سکول جانا مقصود ہو تو پہلے وہاں جائیں کسی کے گھر جانا ہو تو وہاں بھی جا سکتے ہیں۔ بعد میں بازار خریداری وغیرہ کر کے ایک دن ایک ہی تیاری میں سب کچھ نپٹا لیں۔ ہاں اگر فوری اور ضروری ہو تو الگ بات ہے ورنہ جن چیزوں کے بغیر گزارا ہوتا ہے ایک بار ہی جمع کر کے نکلیں اور بچوں کو بھی بار بار کام سے نہ بھیجیں۔ ایک بار سارا سامان منگوا لیں اس طرح بچے جھنجلا جاتے ہیں کچھ معیاری اور مناسب استری شدہ لباس ہر وقت الماری میں لٹکے رہنے چاہئیں تا کہ جب تقریب وغیرہ پر جانا ہو تو بجلی جانے کی صورت میں بدمزگی نہ ہو۔ استعمال کی چیزیں مثلاً ہتھوڑی، پلاس، پیچ کس، اور کیل وغیرہ مخصوص جگہ پر ٹول باکس وغیرہ میں رکھیں تا کہ بوقت ضرورت بدحواسی سے بچیں۔ گھر کے تمام افراد بشمول مرد اپنی اپنی ضرورت کی اشیاء کپڑے، جوتے وغیرہ خود سنبھال کر رکھیں اور ایک دوسرے کی چیزیں بھی نہ چھیڑیں اس طرح بدمزگی ہو گی نہ محتاجی۔ کھانے کے چکنائی والے برتنوں کے علاوہ پانی پینے کا گلاس، فروٹ، سبزی والی چھلکوں کی پلیٹیں گندے برتنوں میں رکھنے کی بجائے چھلکے پھینک کر کھنگال کر دھلے برتنوں میں واپس رکھیں۔ بلکہ چائے کا کپ بھی اسی وقت کھنگال لیں تو کوئی حرج نہیں بلکہ حفظانِ صحت اور ثواب کا حصول بھی ہے۔ صرف احساس اور سوچ کی ضرورت ہے کیونکہ صرف ایک یا دو منٹ ہی لگتے ہیں۔ اس طرح خاتون خانہ یا ملازموں کو سہولت ملنے پر نیکی بھی ہے اور سلیقہ بھی۔

ائیر پورٹ یا اسٹیشن جانا ہو تو وقت لے کر نکلیں تا کہ راستے میں گاڑی خراب یا ٹریفک بلاک ہونے کی صورت میں پریشانی نہ ہو اگر دوسرے شہر جانا ہو تو ترتیب دیں لیں۔ مثلاً اگر کسی دفتر میں کام ہو تو پہلے وہ کریں کیونکہ دفتر جلدی بند ہو جاتے ہیں پھر خریداری چاہے شام تک کریں۔ اگر کسی رشتہ دار کے ہاں ٹھہرنا ہے تو آخر میں جائیں کیونکہ گھر تو کسی بھی وقت جا سکتے ہیں ساری رقم

ایک ہی جیب میں نہ رکھیں راستے کی ضرورت کے لئے تھوڑے بہت الگ کرلیں وگرنہ ایک دوسو روپے نکالنے پر بڑے نوٹ نکل کر گرنے سے بھی اور جیب کتروں سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔

دوستی:

حدیث رسول ﷺ ہے کہ غریب وہ نہیں جس کے پاس مال یا دولت نہیں بلکہ وہ ہے جس کا کوئی دوست نہیں۔اس سے زیادہ دوست کی اہمیت اور مقام کیا ہوسکتا ہے باقی رشتے تو خدا خود بناتا ہے لیکن دوست کا اختیار انسان کو دیا ہے اس تعلق سے انسان کی فہم وفراست کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیونکہ دوست ہمارا آئینہ ہوتا ہے جس کے ذریعے دوسرے ہمیں دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔حالانکہ دوست کی بھی کئی قسمیں ہیں ایک وہ جو ہماری عادات ، مزاج ، اخلاق اور اندازِ گفتگو سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے خود بخود ہی قریب ہوجاتے ہیں۔دوستی کی حقیقی قسم یہی ہے۔دوسرے وہ جو کسی کے انداز وامارت یا معاشرے میں نمایاں مقام سے مرعوب ہوکر دوستی کی کوشش کرتے ہیں جس میں وہ بالآخر کامیاب بھی ہوجاتے ہیں جو کہ دوستی کی شکل میں خاموش سمجھوتہ ہوتا ہے۔یعنی ایک کو کام اور دوسرے کو نام چاہیے اس لیے کہیں جانا ہو تو کمپنی کیلئے یا اکیلا پن دور کرنا ہو یا گھر میں تقریب یا مشکل میں یہ نام نہاد دوست طلب کرنے پر خدمت گزار کی طرح حاضر رہتا ہے۔جب اُس کے گھر وہ خوشی کے موقع پر چلا جائے تو نہال ہوکر دیوانہ وار سب سے فخریہ انداز میں اس کا تعارف کرواتا ہے اور دکھ والم کے موقع پر اپنے غم کو بالائے طاق رکھ کر اس کی خدمت میں جُت جاتا ہے کیونکہ وہ کسی طور اس کو شکوے کا موقع نہیں دینا چاہتا جبکہ اسے خود شکایت ہو تو لب پر نہیں لاتا۔گاہے گاہے ملنے والی امداد اور اترن بھی تو مدنظر ہوتی ہے بہرحال دم چھلہ ہونے کے باوجود دوستی کے زمرے میں تو آ ہی جاتا ہے۔پہلی قسم کی دوستی میں بھی دو طرح کے دوست

ہوتے ہیں ایک عیش وعشرت اور ہم نوالہ و پیالہ میں راز دان اور دوسرے پند نصیحت و برائی سے روکنے اور اچھائی کی تلقین کر کے سدھارنے والے مخلص اور ہمدرد جن کی نہ صرف ہم بلکہ گھر والے اور عزیز واقارب بھی قدر کرتے ہیں اور عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے۔ ہیں تاہم بلا تفریق اقسام، حقیقی دوست وہ ہے جو مشکل و پریشانی میں اگر کوشش کے باوجود بھی کام نہ آسکے تو ڈھارس بندھائے اس کو اکیلا نہ چھوڑے۔ حسب صلاحیت اسے مخلصانہ اور ہمدردانہ مشورہ بھی دے۔ اس محترم اور معتبر تعلق کو مضبوط اور باوقار بنانے کیلئے حتی الوسع کوشش کریں کہ اپنے مسائل اور پریشانیاں اور ضرورتیں بتا کر ہمدردی لینے کی کوشش نہ کریں نہ قربانی مانگیں۔ حالانکہ مخلص اور حقیقی دوستی کا تقاضہ ہے کہ ایسے موقع پر خود حق دوستی ادا کرے کیونکہ سو فیصد اخلاص اور ایثار کی توقع رکھنا عبث ہے۔ جب ہم خود اپنے لیے انسانی تقاضے بھی پورے نہیں کر پاتے اور چاہتے ہیں کہ دوسرا ہمارے لئے فرشتہ بن جائے۔ جو آپکو آزمانے کی بات کرے وہ سچا اور مخلص تو کیا وہ دوست ہی نہیں ہوتا۔ محفل میں آپ کی کسی غلطی کو نظر انداز کر کے دبانے کی بجائے نمایاں کر کے شرمندہ کرنے والا دوست کہلانے کا حقدار نہیں۔ اصل دوست وہ ہے جو ایسے موقع پر کوئی غلطی کو اچھالے بھی تو حمایت کر کے اسے حزیمت اور سبکی سے بچائے اور علیحدگی میں اسے سمجھائے کہ بات تو تمہاری غلط ہی تھی میں نے سنبھال لی ہے، ذرا احتیاط کر لیا کرو۔ ایسے بے لوث اور با اعتماد دوست سے ہم ہر وہ مسئلہ و پریشانی بیان کر سکتے ہیں جو ہم اپنے بہن بھائیوں یا خاندان سے کرنا ضروری یا مناسب نہیں سمجھتے۔ اس لئے غم گسار اور خیر خواہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنا دل کھول رکھ دیتے ہیں تا کہ اس کے ہمدردانہ اور قیمتی مشوروں سے مستفید ہو سکیں۔ ایسے نایاب اور قابل فخر دوستوں کی قدر کر کے ہم اپنی زندگی کو پر اعتماد با مقصد اور باوقار بنا سکتے ہیں۔ جب کہ خود غرض، لالچی، حاسد، مفاد پرست اور موقع پرستوں کی دوستی کے لبادے میں چھپا بغض وعناد، فریب اور

بے راہ روی کے راستے میں ذلت، تباہی، گمراہی، بدنامی اور پچھتاوا ہے اس لئے آنکھیں کھلی اور دماغ حاضر رکھ کر دوستوں کا انتخاب کریں۔

احترام مسجد و امام کی ذمہ داریاں:

مساجد کا وجود صرف نماز ہی نہیں بلکہ ہمہ گیر مقاصد کیلئے ہے۔ خدا کا گھر ہونے کے ناطے یہ سب سے زیادہ عزت واحترام اور اہمیت کی متقاضی ہیں۔ نماز کیلئے مسجد جانے کیلئے جو وقت مختص کیا جاتا ہے کوشش کرنی چاہیے اس دوران زیادہ سے زیادہ اللہ کی خوشنودی ورضا اور ثواب حاصل کیا جاسکے تاکہ اپنے قیمتی وقت کو مزید قیمتی بنایا جائے۔ گھر سے وضو کر کے جانے کا ثواب زیادہ ہے۔ مسجد آتے جاتے خاموشی سے بہتر ہے مقبول ومسنون، تسبیحات اور درود شریف کا ورد کریں۔ مسجد میں فالتو باتیں کرنا خلاف ادب واحترام ہے۔ زیادہ ضروری ہو تو آہستہ اور مختصر بات کرلیں تاکہ سنتیں یا نوافل پڑھنے والے ڈسٹرب نہ ہوں۔ بعد میں آنے والے صف کے اس طرف کھڑے ہوں جدھر نمازی کم ہیں تاکہ سنت کے مطابق صف برابر اور خوبصورت رہے۔ بچوں کی تربیت کر کے مسجد لائیں تاکہ ان کی بچگانہ اور غیر سنجیدہ حرکتوں سے دوسروں کی نماز میں خلل نہ پڑے۔ موبائل آف کرنا بھول جائیں تو دوران نماز بھی بجنے پر بند کر سکتے ہیں۔ نماز کا وقت بدلنے پر اسی وقت بورڈ وغیرہ پر بھی نیا ٹائم بدل دیں تاکہ بعد میں آنے والے نمازی نوٹ کرلیں نہ کہ اگلے دن لاعلمی کی وجہ سے آئیں تو جماعت ہو چکی ہو۔ اس کا گناہ نمازی کو تو نہیں لیکن ذمہ دار کو ہو سکتا ہے۔ پہلے آنے والے اگلی صفوں کو پر کریں تاکہ بعد میں آنے والوں کو پھلانگ کر آگے نہ جانا پڑے کیونکہ اگلی صف میں ثواب بھی زیادہ ہوتا ہے نماز کی ادائیگی بھی قدرے بہتر انداز میں ہوتی ہے۔

صفائی کو برقرار رکھنے کے لیے وضو والی جگہ پر ناک یا گلہ صاف کرنے سے پہلے نل کھول دیں تاکہ

بہتے پانی میں مواد بہہ جائے ورنہ گندگی جمنے کا اندیشہ ہے۔ان کے علاوہ مسجد ونماز کے احترام سے متعلقہ تمام باتیں سمجھانا امام کی ذمہ داری ہے کیونکہ نمازی ایک دوسرے کو ٹوکیں گے تو جھگڑے کا احتمال ہے۔بعض بااثر نمازی اپنی اجارہ داری سمجھتے ہوئے خلافِ ادب وتہذیب کچھ بھی کرلیں دوسرے ڈر یا تعلقات کی خرابی کے خدشے کی وجہ سے خاموش رہتے ہیں۔ چنانچہ ایسے معاملات میں امام کوکسی مصلحت کے بغیر اپنا مضبوط اور مئوثر کردار ادا کرنا چاہیے جو اس کا حق بھی ہے اور فرض بھی۔ اس طرح مسجد کا ماحول بھی خوشگوار اور مہذب ہونے کے ساتھ ساتھ امام صاحب کی قدر ومنزلت میں بھی اضافہ ہوگا۔

محلّہ یا علاقہ کی فلاح و بہبود یا دیگر مسائل کے سلسلے میں اجتماع جمعہ کی نماز کے بعد رکھیں تا کہ زیادہ سے زیادہ افراد کی شمولیت ممکن ہو سکے۔عیدین کا وقت کمیٹی مقرر کرے۔تمام نمازیوں سے مشورہ کرنے میں شور شرابہ بھی ہوتا ہے اور مختلف آرا کی وجہ سے سب مطمئن بھی نہیں ہوتے۔یاد رہے ہم مسجد اللہ کی اطاعت وخوشنودی اور ثواب کے لئے جاتے ہیں یہ نہ ہو کہ منفی اور خلاف ادب رویوں کی وجہ سے گناہ لے کر آجائیں۔

دعا مانگنے کے آداب:

عام طور پر ہم اپنے مفاد یا دنیاوی ضروریات کے لئے کسی بااثر اور اتھارٹی والے شخص یا ملازمت میں صاحب اختیار کے سامنے بڑے باادب اور مہذب طریقے سے کھڑے ہوتے ہیں۔لیکن سب سے بڑے حاجت روا یعنی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہوئے عموماً ادب واحترام کا فقدان رہتا ہے۔بعض دعا مانگتے ہوئے دیوار یا تکیہ وغیرہ سے ٹیک لگائے رکھتے ہیں حتیٰ کے فاتحہ خوانی پر تو لیٹے لیٹے ہی دعا کررہے ہوتے ہیں۔ستم تو یہ ہے کہ بعض ناعاقبت اندیش اس پاکیزہ تقریب میں سگریٹ نوشی بھی کرتے ہیں۔اس پر بجائے حوصلہ شکنی کے غمزدہ میزبان ایش ٹرے وغیرہ رکھ کر

اس غیر مہذب اور قبیح فعل کو تقویت دیتے ہیں ۔ حالانکہ سگریٹ نوشی تو دنیاوی محافل میں بھی ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہے جبکہ یہ تو خالصتاً دعائیہ تقریب ہوتی ہے۔علماء کا بھی فرض ہے کہ اسلام کے احکام وعبادات کی ادائیگی کے علاوہ ادب واحترام اوراخلاقیات کو مدنظر رکھنے پر زور دیں۔

کلچر :

مذہبی،مشرقی اور علاقائی روایات کا امتزاج ہی ہمارے کلچر کا حُسن ہے۔اس میں شرم وحیا،عزت اورادب واحترام کے تقاضوں کے مطابق ہم ایک دوسرے کے جذبات اوراحساسات کو مدنظر رکھتے ہوئے تعلقات بناتے اور نبھاتے ہیں جو کہ ہماری روحانی اور قلبی ضرورت بھی ہے۔میڈیا کو بھی چاہیئے کہ ہمارے کلچر کی خوبصورتی اور فطری دلکشی کو حقائق کے مطابق اجاگر کرے جبکہ ہمارے ڈراموں اور دوسرے پروگراموں میں اس کے برعکس دکھایا جاتا ہے ۔مثلاً ہیروئن گویا گائے ہے جو صبر و برداشت اور بے بسی کی تصویر بنی سسرال کے ظلم وستم اور بیہودہ الزامات پر بھی صفائی تک نہیں دیتی۔محبت کے بلند بانگ دعوے کرنیوالا شوہر نہ صرف خاموش رہتا ہے بلکہ ذرا سے کان بھرنے پر اعتماد اور بھروسے کا خون کرتے ہوئے الٹا اسی کو موردِالزام ٹھہراتا ہے۔جبکہ ماں کے مقدس رشتے کو بدنام کر کے سازشی و لالچی اور حسد وعناد میں جل کر بیٹے کا گھر اجاڑنے میں اخلاقیات وتہذیب کی دھجیاں اڑا کر گھٹیا پن کی تمام حدود پار کر کے پھر مظلوم بھی بن جاتی ہے۔جیسے ڈرامہ دیکھنے والے بیوقوف اور ناسمجھ ہوں۔اس طرح ان کہانیوں میں عام معاشرے کی عکاسی بالکل نہیں ہوتی ۔ایسے ظالم یا مظلوم دکھائے جاتے ہیں جو حقیقی زندگی اور معاشرتی تقاضوں میں وجود نہیں رکھتے۔۔

بات بے تکے پن تک ہی محدود نہیں بلکہ اب تو غیر اخلاقی اور غیر شرعی کردار اور کہانیاں دنیا

بالخصوص غیر ملکیوں کو دکھا کر ہمارے کلچر کی خوبصورت اور مہذب تصویر کی بجائے نہایت گھٹیا اور شرمناک تصویر پیش کی جارہی ہے۔مثلاً ایک ڈرامہ میں ایک لڑکی کے دوشوہر ہیں ایک کے پاس وہ رہی ہے جبکہ بچہ دوسرے سے ہونیوالا ہے۔جس شوہر کے پاس رہ رہی ہے وہ بچے کو پیدا ہونے سے پہلے ہی ختم کرنیکی کوشش کرتا ہے جو سراسر ہمارے مذہب اور کلچر کے خلاف ہے۔ ایسی غیر مہذب اور اخلاق سے گری مذموم کوششوں کے خلاف اقدامات اُٹھانے چاہیئں تا کہ ہمارے کلچر کی حقیقی عکاسی اجاگر ہو جو کہ لطیف جذبوں، درد دل واحساس اور ایک دوسرے کے احترام سے لبریز ہے۔

معاشرتی وگھریلو مسائل و پریشانیاں دور کرنے کے غرض سے باآسان اور میسر ذریعے سے مختلف چینلز کا سہارا لیا جاتا ہے لیکن انہیں دیکھنے سے ذہنی دباؤ اور تناؤ میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ نیکی اور اچھائی کو کامیاب وسرخرو اور برائی و بدی کو ناکام و نامراد دیکھنا انسانی فطرت ہے جبکہ ہمارے ڈراموں وغیرہ میں ظالموں اور سازشیوں کو کامیاب اور نیک درد دل رکھنے والوں کو بے بس دکھا کر صبر و برادشت پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔زندگی کا ایسا گھناؤنا رخ دیکھنے والے تفریح و ذہنی سکون کے برعکس مزید ڈپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔صرف آخری قسط کے بھی آخری حصے میں منفی کرداروں کا انجام دکھا کر کہانی ختم کر دی جاتی ہے جس سے تفریح یا سبق حاصل کرنیکے مقاصد پورے نہیں ہوتے۔اس لئے پرانی، گھسی پٹی کہانیوں کی بجائے جدید تقاضوں کے مطابق تفریح وطبع کے آئیڈیاز تخلیق کرنیکی ضرورت ہے جو کہ تیزی سے بدلتی نئی سوچ کے مطابق قابل قبول ہوں۔

کہانی جو بھی ہو مگر ہمارے فنکاروں میں بے پناہ صلاحتیں ہیں جن کا اعتراف انکا حق ہے جیسے طنز ومزاح کے پروگرام حسب حال میں سہیل احمد کی ورائٹی اور کوالٹی بے مثال بنے۔ یہ شاید واحد

پروگرام ہے جس کی ساری ٹیم ہی حسِ مزاح اور کردار کے معیار وضرورت پر پورا اترتی ہے۔ معاشرتی مسائل اور اخلاقی انحطاط کی نشاندہی بھی اچھوتے انداز میں کرنا قابل ستائش ہے۔ میزبان جنید سلیم بھی ملا جُلا رول بخوبی نبھاتے ہیں۔اس تخلیقی تنزلی کے دور میں یہ پروگرام تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔اس کے علاوہ خبردار کے میزبان آفتاب اقبال کی قابلیت اپنی جگہ لیکن پروگرام تو شورشرابہ ہی ہے۔آفتاب اقبال تو بڑے زیرک ناقد ہیں انہیں اس کی اصلاح کرنی چاہیے کھلاڑیوں کو اور فنکاروں کو سفارش اور اقرباء پروری سے دور رکھنا اس لیے بھی ضروری ہوتا ہے کہ بالآخران کی پرفارمنس کے بعد ناقص صلاحیتیں سب پر ظاہر ہونے پر تنقید اور بدنامی کی وجہ سے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ شرمندہ ہونے کیلئے شرم ہونا ضروری ہے۔ پروگرام کا حصہ بننے والے مشہور فنکار شوبز تک محدود سوالات کا ایک فنکار بھی جواب نہیں دے سکتا مثلاً کسی گانے کا ابتدائی میوزک اور فنکار دکھا کر اس کے زبان زدِ عام بول پوچھنے پر سب ناکام ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ انکا شعبہ ہے جبکہ ہم گھروں میں بیٹھے دیکھنے والے فوراً سمجھ جاتے ہیں جن کا شوبز سے دور کا تعلق نہیں ہوتا۔اسی لیے صحیح جگہ پر صحیح شخص کا انتخاب نہ ہونے کی وجہ سے ادارے تباہ ہو جاتے ہیں۔

سیاسی تھیٹر وصی شاہ کی شخصیت سے مطابقت نہیں رکھتا بہتر ہے اپنے آپ کو ضائع نہ کریں۔ مذاق رات میں مہمانوں کی سبکی کرنا مناسب نہیں۔ تمام شعبوں کی خوبیوں اور خامیوں کے قطع نظر ہمارے ملک کے فنکار بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔جن میں سرفہرست طارق عزیز کا گھن گرج والا پراعتماد لہجہ اور جذبہ حب الوطنی سے سرشار گفتگو اور نعرے انہی کا خاصہ ہیں۔ بشریٰ انصاری نے تو ہر روپ میں اپنے آپ کو منوایا ہے بلکہ ساری بہنوں نے ہی اپنے متعلقہ شعبوں میں نام پیدا کیا ہے۔اتنی ناموری کے باوجود یہ بہنیں نہایت سادہ اور کھلے دل کی مالک ہیں۔

چھوٹی چھوٹی ذاتی باتیں بھی ناظرین سے یوں شیئر کرتی ہیں جیسے اپنی فیملی ہو۔ بشریٰ جتنی بھی ماڈرن بنے مگر اس میں مذہبی جھلک بھی ہے۔ اسی طرح فاطمہ ثریا بجیا کی فیملی بھی فنی صلاحیتوں کے علاوہ طریقہ سلیقہ، رکھ رکھاؤ، رواداری، تہذیب واخلاق اور انسان دوستی میں اپنی مثال آپ ہے۔ مجموعی طور پر تو تقریباً تمام اداکار اچھا کام کر رہے ہیں لیکن بعض نے تو اس فیلڈ میں فن کی بلندیوں کو چھو کر نمایاں مقام بنایا ہے۔ حمد ونعت میں اُم حبیبہ کا کوئی ثانی نہیں۔ اینکرز میں طلعت حسین اور نسیم زہرہ کا انداز حقیقت پسندانہ ہے۔ تجزیہ نگاروں اور ماہرین میں انصار عباسی موضوع پر مکمل دسترس رکھتے ہیں ان کے علاوہ ہارون رشید، ارشاد بھٹی کا بے باک اور مجیب الرحمٰن شامی کا سیدھا سادھا انداز قابل ستائش ہے۔

سماجی بدصورتیوں کو جس طرح سرِ عام، گرفت اور بے نقاب جیسے پروگراموں نے واقعی بے نقاب کیا ہے وہ قابلِ تعریف وتحسین ہے اس طرح ''محاذ'' میں وجاہت سعید کی کوششیں بھی اہم و مستحسن ہیں۔ جبکہ کورٹ نمبر 5 کے پروگرام کو حکومتی سطح پر حقیقی شکل دے کر مستحق اور نادار متاثرین و سائلین کو بلا معاوضہ قانونی امداد کے ذریعے انصاف کی فراہمی کو نا صرف ممکن بلکہ یقینی بنانا چاہیے۔

یہ ہمارا کلچر نہیں ہے:

ہر قسم کے لوگ ہر جگہ پر ہوتے ہیں حتیٰ کہ ایک گھر میں مختلف الخیال سوچ وفکر، عادات، اطوار اور مزاج کے حامل افراد ہوتے ہیں۔ لیکن خاندان کا ایک مجموعی تاثر ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً اچھی شہرت کی فیملی میں ایک آدھ برا اور بری شہرت کی فیملی میں کوئی اچھا ہو تو مجموعی رائے میں فرق نہیں پڑتا۔ ذرا غور کریں تو دنیا میں برے اور جرائم پیشہ لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں۔ جیسے دس ہزار آبادی والے محلے یا گاؤں میں ایک سو سے بھی کم چور، فراڈیے اور بدمعاش وغیرہ

ہونگے مگر 99 فیصد کو محتاط ہونا پڑتا ہے جس کے نتیجے میں ہم اچھے لوگوں کی اچھائی سے بھی محروم ہوجاتے ہیں ان پر بھی بھروسہ اور اعتماد کرنے سے کتراتے ہیں۔ جیسے ایک مچھلی سارے تالاب کو گندا کردیتی ہے ایسے ہی ان بدخصلتوں کی وجہ سے معاشرے کا حسن گہنا جاتا ہے جس وجہ سے یہ تکلیف دہ جملے سننا پڑتے ہیں کہ زمانہ خراب ہے، بھلائی کا زمانہ نہیں، سگوں پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے، خون سفید ہوگیا ہے۔ حالانکہ ایسا تاثر صرف ایک آدھ فیصد کی وجہ سے ہے جبکہ حقیقی معاشرہ محبت، احساس، ہمدردی، وفاداری، احترام، شرم وحیا، اخلاق، حسنِ سلوک کا غماز ہے۔ ہمیں عام غیر شائستہ رویوں کی اصلاح کی بھی ضرورت ہے مثلاً بعض بالخصوص مرد حضرات گلی محلے سے گزرتے ہوئے دوسروں کے گھروں میں جھانکتے اور لغو گفتگو و بیہودہ جملے بازی بلکہ گالیاں تک دیتے ہوئے نہیں سوچتے کہ گھروں میں عورتیں بھی سن سکتی ہیں۔ بعض ہٹ دھرم کتوں کے ساتھ گھومتے ہیں جو پاس سے گزرنے والوں پر لپکیں تو ڈرنے پر تسلی دیتے ہیں کہ کاٹتا نہیں۔، گویا خوفزدہ کرنا ان کے لئے معمولی بات ہے۔ اسی طرح راہ چلتی عورتوں کو گھورنے کی عادتِ بد سے تو شرفا بھی محفوظ نہیں۔ مزید ستم ظریفی یہ کہ عورتوں کے لیے انتہائی تکلیف دہ اس حرکت کو خاص برائی بھی نہیں سمجھا جاتا۔ بعض نو دولتیئے اور جاہل تیزی سے کیچڑ پر گاڑی دوڑاتے ہوئے قریب سے گزرنے والوں پر پڑنے والے گندے چھینٹوں کی پرواہ تک نہیں کرتے۔ بلا وجہ ہارن بجا کر دوسروں کو اذیت دینا تو معمولی بات سمجھتے ہیں اور اپنے سے کمتر سواری یعنی بائیک یا سائیکل والوں کو حقیر جانتے ہوئے راستے پر اپنا حق زیادہ سمجھتے ہیں اور خواہش رکھتے ہیں کہ وہ راستے سے ہٹ جائیں گویا گاڑی کی طرح سڑک بھی ان کی ملکیت ہے۔ پیدل چلنے والوں کو تو جیسے ملازم سمجھتے ہیں اسی لیے راستہ یا ایڈریس پوچھنا ہو تو خود اترنے کی بجائے ان کو اشارہ کر کے اپنے پاس بلاتے ہیں۔ شادی بیاہ یا جیت کی خوشی کے علاوہ مختلف مواقع پر ہوائی فائرنگ کا خطر

ناک مظاہرہ نہ صرف ہمارے کلچر کے خلاف ہے بلکہ اخلاقی گراوٹ کی بدترین صورت بھی ہے جو بے گناہ اور معصوم انسانی جانوں کے ضیاع کا سبب بنتی ہے۔اس ظالمانہ کھیل کے ذمہ دار صرف جاہل افراد ہی نہیں بلکہ بے حس اور نااہل حکمران بھی ہیں جو اس مجرمانہ فعل کے خلاف ضروری کروائی نہ کر کے اس ظلم و زیادتی میں برابر کے شریک ہیں۔اس طرح کے منفی رویے ہمارے خوبصورت کلچر کو داغدار کرتے ہیں جن کی اصلاح ضروری ہے۔

بے تکادین:

کسی کے نقصان کرنے حتیٰ کہ بدتمیزی کرنے پر بھی اتنا غصہ نہیں آتا جتنا کہ بے تکے پن پر آتا ہے۔مثلاً ملازم بغیر اجازت چھٹی کر لے اور واپسی پر یہ جواب دے کہ اجازت اس لئے نہیں لی کہ آپ نے انکار کر دینا تھا۔یا کوئی گلی یا راستے کے درمیان گاڑی کھڑی کر دے اور کوئی دوسری گاڑی آنے پر ہٹانے کا کہیں تو معذرت کی بجائے کہے کہ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ کی گاڑی بھی یہاں سے گزرے گی۔حالانکہ اسکا آسان سا جواب ہے کہ اگر گاڑی آنے کا علم نہیں تو نہ آنے کا علم کیسے ہو گیا۔سیدھا اور آسان ان کے لیے ہے جو سمجھنا چاہیں۔ایسے جاہل اور ہٹ دھرم لوگوں سے بحث و تکرار کر کے اپنی پوزیشن خراب کرنے سے بہتر ہے سر دھن کر خاموش ہو جائیں۔اس کے علاوہ امام کے لیٹ آنے پر کوئی نمازی وجہ پوچھے تو جواب دے کہ آپ بھی تو لیٹ آتے ہیں۔حالانکہ نمازی نہ بھی آئے تو اس پر ذمہ داری نہیں۔اس بے تکے جواب پر اس لئے بھی خاموش ہونا پڑتا ہے کہ امام صاحب کے احترام کو ملحوظ نہ رکھنے کی پاداش میں ان کے غیض و غضب کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔امام کا احترام ضروری ہے مگر مذہب کی غلط تشریح کی قیمت پر نہیں۔ یا کوئی دوستوں کی محفل سے گھر جانے کا ارادہ کرے تو بھی ایک فضول سا جملہ کہہ دیا جاتا ہے کہ گھر جا کے کیا کرنا ہے۔حالانکہ گھر تو کوئی اسی وقت جاتا ہے جب کچھ نہ کرنا ہو جبکہ کچھ نہ

کچھ کرنے کیلئے تو گھر سے باہر جاتے ہیں۔ ویسے بھی فیملی کو وقت دینے، آرام کرنے، ٹی وی کے پسندیدہ پروگرام دیکھنے کے علاوہ اپنے اور گھر والوں کے کئی طرح کے چھوٹے موٹے کام ہونے کی وجہ سے بھی گھر رہنا ضروری ہوتا ہے۔ آجکل بالخصوص دفاتر میں سادہ پانی پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ پانی کی ضرورت ہو تو مہمان خود بھی مانگ سکتا ہے اس میں تکلف کیا ہے۔ جبکہ خود خاطر تواضع کرنا ہو تو چائے، کولڈ رنک یا کھانے پر اصرار کریں۔ یہ بے تکا پن ہی نہیں بلکہ بیوقوف بنانے کے بھونڈی کوشش ہے۔ یا کسی کو یقین دلانے کیلئے کہنا کہ بات 110% سچ ہے حالانکہ سو فیصد سے زیادہ تو حد ہی نہیں اگر 200 یا ہزار فیصد بھی کہہ دیں تو تسلی نہیں ہوگی الٹا پھسپھسا ہی لگے گا۔ جیسے گلاس بھر جانیکے بعد مزید پانی ڈالیں گے تو باہر ہی گرے گا جو ظاہر ہے منفی اثر ہی پڑے گا۔ اسی طرح کوئی زیادتی کرے تو اس کی بجائے دوسرا اس کی طرف سے معذرت کرے۔ اس طرح تو اصل قصور کرنے والا سدھرنے کی بجائے اور بگڑے گا۔ وہ جو چاہے کرتا پھرے اس کے گھر والے معافیاں مانگتے رہیں گے۔ حالانکہ شریف یا کمزور لوگ تو ویسے بھی برداشت کر لیتے ہیں معافی کا ڈھونگ ضروری نہیں۔ جبکہ طاقتور ہو تو مجرم کے خود معافی مانگنے پر بھی معاف نہیں کرے گا بلکہ بدلہ لے گا۔ اسی طرح چوری ہونے پر لوگ چور کو برا بھلا کہنے کی بجائے گھر والوں پر تنقید شروع کر دیتے ہیں کہ دروازہ کھلا کیوں تھا یہ آپکی غلطی ہے۔ ان کو حوصلہ دینے کی بجائے الٹا انہیں چوری کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ حالانکہ دروازے یا گیٹ کو کنڈا نہ لگانے کا یہ مطلب تو نہیں کہ چور کو چوری کا حق حاصل ہو گیا۔ جبکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ہر وقت دروازے پر تالہ لگا رہے کبھی کوتاہی ہو بھی جاتی ہے۔ مگر چوری تو بہت بڑا جرم ہے یا بینک وغیرہ کا کیشئر غلطی سے زیادہ پیسے دے تو پیچھا کرنے پر کسٹمر معذرت کی بجائے کہے کہ آپ نے زیادہ دیئے تو میں نے لئے ہیں غلطی تو آپ کی ہے۔ حالانکہ کیشئر نے واقعی غلطی کی ہے جب کہ کسٹمر نے تو جرم کیا

ہے۔لیکن وہی بے تکا الزام یعنی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔اسی طرح ٹی وی چینلز والے بھی اکثر بے تکی خبریں دیتے رہتے ہیں مثلاً قمری مہینوں کے 29 کے چاند کی خبر تو بنتی جبکہ بعض 30 دن کے بعد بھی خبر دیتے ہیں کہ چاند نظر آ گیا یا کرکٹ کی خبر پر کم اسکور پر کہنا کہ سات کھلاڑی ہونے پر 50 رنز بنا لیے جبکہ خبر یہ ہونی چاہیے کہ 50 پر سات آوٹ ہوگئے۔ یا ہاکی یا فٹ بال میچ پر کہنا کہ مخالف ٹیم نے پہلا گول کر دیا جس سے تاثر ملتا ہے کہ اور بھی گول ہونگے خصوصاً جب اپنے ملک کی ٹیم کے خلاف ہو تو خبر یہ دینی چاہیے کہ مخالف ٹیم نے گول کر دیا اس طرح جائز کام کیلیئے رشوت دینا پڑے تو بعد میں رشوت خور کی شکایت کی جائے تو جواب میں کہتا ہے کہ انہوں نے خود دی ہے تو میں نے لی ہے۔یعنی چوری اوپر سے سینہ زوری۔حالانکہ جائز کام کیلئے رشوت لی جبکہ ناجائز کام کیلئے دی جاتی ہے اگر چہ رشوت گناہ اور جرم ہے لیکن جائز مقصد کیلے جسے دینا پڑتی ہے وہ مجبور ہے۔مجبور کی تو دادرسی کرنی چاہیے۔یا آپ کی کوئی چیز ادھر اُدھر رکھ دے تو استفسار پر ملازم جواب دے کہ، چلیں میں واپس رکھ دیتا ہوں لیکن اصل جواب نہیں دیگا کہ بدلی کیوں ہے۔ یا کسی کو کوئی کام ذمہ لگائیں وہ نہ کرے تو پوچھنے پر شرمندہ ہونے کی بجائے کہے کہ آپ نے دوبارہ یاد ہی نہیں کرایا۔حالانکہ یہ کہنا چاہیے کے مجھے یاد نہیں رہا۔یعنی الٹی گنگا بہنا۔یا کسی خامی کی نشاندہی مثلاً ازار بند نظر آنے پر توجہ دلائیں تو شکریہ کی بجائے کہے کہ یہ چلتا ہے اور کھسیانہ ہو کر اڑس بھی لے۔یا ملکی ٹیم جیتنے پر خوشی یا شکر کی بجائے کہنا مخالف ٹیم کمزور تھی ہم اس لئے جیت گئے۔جیسے گند کی مکھی گند پر ہی بیٹھتی ہے۔یا اتنی سردی تو نہیں کہ گرم کپڑے پہن رکھے ہیں جبکہ خود نہ پہن کر ٹھٹھر ہی رہا ہو یا آج پیدل چل رہے ہو گاڑی یا بائیک کہاں ہے گویا کسی کو اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق ہی نہیں۔کسی سواری کو سموکنگ سے منع کریں تو وہ معذرت کی بجائے الٹا کہے کہ آپ کو مسئلہ ہے تو ذاتی گاڑی پر سفر کر لیں حالانکہ یہ کام اسے خود کرنا چاہیئے

کیونکہ پبلک ٹرانسپورٹ میں تو جرم ہے۔اس نے یہ عیاشی یا بدتہذیبی کرنا ہے تو وہ اپنی گاڑی میں سفر کرے۔قانون پر عمل کروانے والے ادارے اپنی ذمہ داری نہیں نبھا ہیں گے تو لوگ آپس میں ہی الجھیں گے۔بات زیادہ بڑھنے پر عین ممکن ہے لوگ سمو کر کی بجائے منع کرنے والے کے خلاف ہی ہو جائیں جو ہمارے معاشرے کی بگڑی شکل ہے کہ حق اور سچ کا ساتھ دینا مشکل ہو گیا ہے۔اسی طرح ہم خوامخواہ دوسروں کے حمایتی بن جاتے ہیں جب کہ وہ موجود بھی نہ ہو مثلاً کسی دوست یا رشتہ دار کی زیادتی پر ہم دل ہلکا کرنے کیلئے کسی کو اپنا ہمدرد سمجھ کر دوسروں کی زیادتی کا رونا روئیں تو وہ الٹا اسی کا ہی وکیل بن جائے۔اگر چہ وہ مخالف کی غلطی کو دل سے تسلیم بھی کرتا ہو مگر فوراً دوسرے کی بات مسترد کر دینا عادت بن چکا ہے۔ بعض سیدھی سی بات کا اکھڑ پن سے جواب دیتے ہیں۔مثلاً کوئی راستہ میں ملے تو پوچھیں کہ کہاں سے آرہے ہو تو جواب دے کہ بازار سے اور کہاں سے آنا ہے۔جبکہ اس طرف بازار کے علاوہ بھی کئی جگہیں ہیں یعنی بینک، ہسپتال یا کسی دوست، رشتہ داروں کے ہاں سے بھی آسکتے ہیں۔مگر سیدھا جواب دینے کی عادت نہیں۔بعض بے وقوف پسندیدہ شخصیت یا کتاب کے جواب میں رسول پاک ﷺ اور قرآن مجید بتاتے ہیں جبکہ یہ مقدس ہستی و کتاب ان مقابلوں سے بالاتر ہیں ان کی پسندیدگی میں دورائے نہیں ہوسکتیں اور سوال کرنیوالے کا مقصد ان دونوں کے علاوہ ہی ہوتا ہے جس میں مختلف آرا ہوسکتی ہیں۔جو طے شدہ حقیقت ہے اس بارے میں سوال جواب کی کیا تک ہے اور ایک فضول سا جملہ تقریباً سب ہی بولتے ہیں کہ کیا فرق پڑتا ہے اگر ہم تھوڑا دیر سے آئے۔اس کے برعکس اگر کوئی بروقت آئے تو میزبان تعریف و تحسین کی بجائے ہونقوّں کی طرح دیکھتے ہیں کیونکہ ابھی گھر والوں کی اپنی تیاری ہی مکمل نہیں ہوتی۔مزید مہمانوں کے آنے پر جب اصرار کیا جاتا ہے کہ تقریب شروع کریں کہ واپس بھی جانا ہے تو میزبان کہیں گے کیا فرق پڑتا ہے تھوڑا انتظار کرلیں

تو، کیونکہ اہم فیملی ابھی نہیں پہنچی گویا وقت کی پابندی کرنیوالے غیر ذمہ دار و کم اہم اور بے قدری کرنے والے اہم اور معزز ہوگئے۔ یا کوئی طالب علم نقل کی اُمید پر امتحان کی تیاری نہ کرے اور فیل ہونے پر نقل نہ کروانے والے کو اپنی ناکامی کا ذمہ دار سمجھے۔ اسی طرح سارا دن دفاتر کھلے رہتے ہیں مگر کوئی وقت ختم ہونے کے بعد آئے تو بھی کہے کہ کیا فرق پڑتا ہے اگر ہم ذرا لیٹ ہوگئے۔ جبکہ گاڑی اور افطاری کے موقع پر وقت سے بھی پہلے پہنچ جاتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ یہاں لیٹ ہوئے تو بہت فرق پڑ جائیگا۔ یعنی پانچ سات منٹ بھی لیٹ ہونے پر گاڑی بھی مس ہوسکتی ہے اور افطاری بھی، گویا مفاد اور فائدے کیلئے ہم پابندی کر سکتے ہیں تو دوسروں کے لیے بھی احساس کرنا چاہیے۔ اصل وجہ ترجیحات ہیں یعنی جس کو ترجیح دیں گے وہ ہر صورت کر لیں گے ورنہ بہانے تو ڈھیر ہیں۔ ویسے بھی وقت کی بے قدری کا فرق صرف بے کار اور نکمے لوگوں کو نہیں پڑتا جبکہ ذمہ دار و محنتی اور کامیاب افراد کیلئے ایک ایک لمحہ بھی قیمتی ہوتا ہے۔ کاش اس حقیقت کو سب سمجھ لیں کہ دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی چیز وقت ہے جس نے اس کی قدر کی وہ کامیاب و کامران جبکہ بے قدری کرنیوالا ناکام و مراد ہوا۔ کوئی باشعور اور عقلمند وقت ضائع ہونے پر نہیں کہے گا کہ کوئی فرق نہیں پڑتا۔

عمومی روئیے:

حدیث رسول ﷺ ہے کہ کسی کے جھوٹا ہونے کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ سنی سنائی بات بغیر تحقیق دوسروں تک پہنچائے اتنے واضح احکامات کے باوجود بھی اس پر عمل نہ کرنے والوں کے اپنے اپنے مقاصد ہیں۔ جن میں حسد، بغض و عناد، مفاد پرستی، خوف، جاہلیت و مخالفت اور منفی سوچ ہوسکتی ہیں۔ مثلاً بعض سادہ لوح جاہل اور کانوں کے کچے فوراً دوسروں پر یقین کر لیتے ہیں یا جس کے خلاف بات ہو رہی ہے سننے والا اسکے لئے بغض و عناد رکھتا ہے وہ نہ صرف سچ سمجھے گا بلکہ بڑھا

چڑھا کر دوسروں کو بھی بتائے گا یا بات سننے والے سے اسے مفاد یا لالچ ہے۔اس لئے اس کی ہمدردی سمیٹنے کیلئے اس کے مخالف کو الٹا، برا بھلا کہہ کر خوشامد بھی کرے گا یا بعض منفی سوچ رکھنے والے چنگاری کو بجھانے کی بجائے اور بڑھکاتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں عورت کو مظلوم، کمزور، مجبور اور بے اختیار سمجھا جاتا ہے۔حالانکہ نہ ساری عورتیں مظلوم ہیں نا سارے مرد ظالم مثلاً جب عورت کسی سے خاوند کی مار کٹائی کا ذکر کرتی ہے تو ہم بغیر تحقیق کے مرد کے خلاف کیچڑ اچھالنا شروع کر دیتے ہیں۔عورت پر ہاتھ اٹھانا بلاشبہ قابل مذمت ہے خصوصاً بعض ہڈحرام، جاہل اور نشئی بات بے بات بیویوں کو مارنا شروع کر دیتے ہیں جو واقعی نا قابل برداشت ہے۔جبکہ بعض پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے مرد بھی مجبور ہو جاتے ہیں کیونکہ عورت ہی عورت کی دشمن ہوتی ہے۔یعنی جب بیوی خاوند کی ماں، بہن پر بیہودہ الزام لگائے گی تو وہ جتنا بھی نفیس اور وضعدار ہوگا خاموش نہیں رہے گا۔اگر برداشت کرے گا بھی تو ماں، بہنیں اسے بے غیرتی اور رن مریدی کے طعنے دے کر بڑھکائیں گی۔لامحالہ ہاتھ اٹھے گا تو شور مچے گا لیکن کوئی بھی پٹائی کی وجہ جاننے کی کوشش نہیں کرے گا۔تمام رشتے آزاد جبکہ سب کو جوابدہ صرف مرد ہی ہوتا ہے یعنی ماں، باپ، بہن، بھائی اور بیوی بچوں کی سوالیہ نظریں اسی پر مذکور ہوتی ہیں حالانکہ وہ سب کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔مگر فریقین اس کوشش کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔ہر کوئی حق سے زیادہ کا تقاضا کرتا ہے اور ماں کے حق اور اختیار کی تو کوئی حد نہیں۔جو چاہے کرے جو مرضی بولے یا زہر اُگلے، گالیوں کی بوچھاڑ کر دے۔مقابلہ تو درکنار ماں کو سمجھانے کی بھی کوشش کریں تو نافرمان بدتمیز، لائی لگ کا خطاب مل جائیگا اور دودھ نہ بخشنے کی دھمکی دے کر جذباتی بلیک میلنگ کر کے اچھا بھلا مقبول اور باوقار انسان مجرم قرار پاتا ہے کیونکہ حقیقت کی بجائے سب اپنی مرضی کی بات سننا پسند کرتے ہیں۔

خواتین کے حقوق کیلئے آواز اٹھانے والی تنظیمیں یہ طے کرلیں کہ کس عورت کیساتھ زیادتی یا ظلم ہو رہا ہے۔ساس، بہو، بہن یا بیٹی کیونکہ ان کے آپس کے جھگڑے کی وجہ سے مرد ہاتھ اٹھانے پر مجبور ہو جاتا ہے یعنی مرد صرف استعمال ہوتا ہے۔ چند جاہل، گنوار، بدفطرت اور بدکردار مردوں کے قطع نظر ہر ذمہ دار اور ذی شعور شخص سب سے یکساں سلوک کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں مجموعی طور پر عورت کو وہی عزت و مقام حاصل ہے جس کی وہ متقاضی ہے۔ یعنی جہاں بھی جائے اس کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے جیسے کہ کسی دفتر یا بینک میں بل وغیرہ جمع کروانے جائے تو لائن کی پابندی کے بغیر ترجیحی طور پر اسکا کام کیا جاتا ہے۔بس یا ٹرین وغیرہ پر سوار ہو تو جوان کیا بوڑھے اور بیمار مرد بھی گوارا نہیں کرتے کہ عورت کھڑی رہے۔کسی مرد سے جھگڑا ہو تو عورت کا قصور ہونے کے باوجود مرد کو ہی سمجھایا جاتا ہے کہ کوئی بات نہیں عورت کے احترام کی وجہ سے نظر انداز یا برداشت کرے اور عورت کو ماں، بہن کہہ کر خاموش کرایا جاتا ہے۔جبکہ مردوں کے شانہ بشانہ کا نعرہ عورتوں کی مذکورہ بالا عزت وتکریم کے برعکس ہے۔یعنی مرد کھڑا ہے تو عورت بھی کھڑی رہے اور لائن میں بھی مرد وزن کی تفریق نہ کی جائے۔اپنی کفالت خود کرے، کسی مضبوط، شفیق، مہربان اور اس کی عزت کی خاطر جان تک قربان کرنیوالے رشتوں کے سائبان کی ضرورت نہ ہو۔دنیا بھر میں اسلام قبول کرنے والوں میں عورتوں کی شرح مردوں سے کہیں زیادہ ہے۔اس لیے کہ یورپ میں عورت کو آزادی کی قیمت پر جن مصائب، الم وکرب اور محرومیوں کا سامنا کرتا پڑتا ہے اس کا ہمارے ہاں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا بقول شاعر

یورپ میں جسے کہتے ہیں عورت کی آزادی دراصل ہے وہ عزت وناموس کی بربادی

جبکہ اسلام نے عورت کی پوری زندگی کی ذمہ داری مرد پر ڈالی ہے۔پیدائش کے بعد باپ اس کے بعد بھائی پھر خاوند آخر میں بیٹا ہر طرح کی کفالت کا ذمہ دار ہے اس کے باوجود اپنا کیریئر

بنانے کی بھی آزادی ہے۔ان نوازشات کے عوض عورت سے ایک ہی تقاضا ہے کہ وہ شرم وحیا اورعزت کی حفاظت کرے جس سے وہ خود بھی معتبر و با کردار اور خاندان کیلئے بھی باعث فخر ہوگی۔ اسی مقصد کے حصول کیلئے ہمارے مذہب اور معاشرے نے خواتین پر کچھ پابندیاں ان کی عزت اور احترام کے پیش نظر عائد کی ہیں تا کہ وہ بری نگاہ ، بدفطرت اور شیطان صفت درندوں سے محفوظ رہیں۔ پابندی صرف عورت ہی نہیں مرد پر بھی ہے۔جیسے خاندان کی کفالت کا پابند، ماں باپ، بچوں، بہن، بھائیوں کیلئے چھت، حسبِ استطاعت خوراک، لباس، ماں باپ، بیوی بچوں کا علاج، بہن بھائیوں، بچوں کی پڑھائی سے لے کر شادیوں تک کی ذمہ داریوں کا پابند ہے۔تنگدستی میں تو عورتوں کو مردوں کا ہاتھ بٹانا پڑتا ہے جبکہ خوشحالی میں خواتین کو عیش وآرام لیکن مردوں کو پھر بھی محنت کرنا پڑتی ہے۔ کیونکہ عورتوں کی آسائشیں بھی مردوں کے کیئریر کی پابندی کی وجہ سے ہیں۔گویا مرد ہر حال اور ہر صورت کمانے کا پابند ہے حتیٰ کہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اسے کمانے پہ مجبور کیا جاتا ہے تا کہ ایک تیر سے دو شکار ہو جائیں۔یعنی کمائیں بھی اور گھر میں ہونیوالی لاپروائیوں اور نقصانات پر ٹوکنے سے بھی بچیں اور سربراہ ہونے کے باوجود گھر کے معاملات میں مداخلت بھی نہ کرے۔

بے شک تمام انسان برابر ہیں لیکن کائنات کا نظام چلانے کیلئے حقوق وفرائض کے اپنے اپنے دائرے ہیں جن کا احترام اور پابندی کر کے ہی ایک فعال اور مہذب معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے۔ اپنے فرائض اور دوسروں کے حقوق مدنظر رکھیں تو ایک مثالی ماحول کا حصول ممکن ہوسکتا ہے اس کے برعکس ہر کوئی اپنے احسان اور قربانیوں اور دوسروں کی ناشکری اور احسان فراموشی اور زیادتیوں کا رونا روتا رہے تو معاشرے کا حسن ماند پڑ جاتا ہے۔مشہور مقولہ ہے نیکی کر دریا میں ڈال۔کیونکہ جو نیکی دریا میں ڈالی جاتی ہے اس کا اجر خدا دیتا ہے اور خدا سے بڑھ کر کس کا اجر ہو

سکتا ہے۔حضرت علیؓ کا قول ہے کہ کسی پر احسان کرو تو چھپاؤ اور تم پر کوئی احسان کرے تو دوسروں کو بتاؤ۔جب کہ بحیثیت مجموعی ہم اس کے الٹ کرتے ہیں اس طرح احسان، احسان نہیں اور نیکی، نیکی نہیں رہتی بلکہ گناہ میں بدل جاتی ہے بجائے نیکی کی حقیقی روح کو سمجھنے کے، کہا جاتا ہے کہ نیکی کا زمانہ نہیں رہا حالانکہ جب تک دنیا قائم ہے نیکی کرنیوالے نیکی اور بدی والے بدی کرتے رہیں گے دونوں خصلتیں تاابد قائم رہیں گی۔

بے شک احسان فراموشی پر تکلیف ہوتی ہے لیکن اتنا ہی اجر بھی زیادہ ہے۔احسان کے جواب کے بھی تین درجے ہیں۔سب سے بڑا تو یہ ہے کہ اپنے محسن کے شکریہ کے ساتھ ویسا ہی صلہ دیں اگر اس کی طاقت یا وسائل نہیں تو مشکور تو رہیں۔کم از کم تیسرے درجے میں تو نہ گریں کہ اس کے خلاف سازشیں یا محاذ آرائی شروع کر دیں۔جیسا کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ جس پر احسان کرو اس کے شر سے بچو! بھلائی اور احسانات کی بھی کئی وجوہات ہیں مثلاً کچھ تو خالصتاً اللہ کی خوشنودی اور رضا کیلئے اور کچھ احسانات، ہم نرم دلی اور ہمدردی کی وجہ سے کرتے ہیں، جو اعلیٰ مقام و درجہ رکھتی ہیں اور درحقیقت نیکی کی اصل روح ہیں جبکہ کچھ ہم اپنے جذبے کی تسکین کیلئے کرتے ہیں۔ جیسے والدین بالخصوص ماں کے دل میں اگر خدا بچوں کے لئے ایثار و محبت، قربانی اور ممتا سے لبریز مضبوط جذبہ نہ رکھتا تو شاید دنیا کا وجود نا پید ہوتا۔اولاد کی خواہش سے بڑھ کر کوئی تمنا آرزو اور جذبہ نہیں۔اسی لیے جب تک اولاد کی امید نہیں لگتی انسان انہی کوششوں میں در در کی خاک چھانتا اور اپنی زندگی کو بے مقصد سمجھتا ہے۔جب اولاد کی نعمت سے بہرہ مند ہوتا ہے تو تمام امیدوں، امنگوں اور خواہشات کا محور و مرکز اس کی اولاد ہو جاتا ہے۔اپنے آپ کی نفی کر کے اس کی پرورش تربیت اور مستقبل کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔خود پرانے لیکن اولاد کے لیے نئے کپڑے، خود بچا کھچا اس کے لئے تازہ اور بڑھیا کھانا، خود سردی، گرمی برداشت مگر اس کو موسموں کے تغیر و تبدل

سے محفوظ، خود عام جبکہ اسے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے تعلیم دلواتا ہے۔فطرتاً انسان کسی کو اپنے سے زیادہ کامیاب برداشت نہیں کرتا، واحد اولاد کو اپنے سے بڑھ کر کامیاب اور خوشحال دیکھنا چاہتا ہے۔ان کی شادیوں کا سوچ کر ہی وہ جھوم جاتا ہے۔ پیٹ کاٹ کر جمع شدہ پونجی خوشی خوشی، حیثیت سے زیادہ خرچ کر راحت اور تسکین محسوس کرتا ہے۔اس جذباتی وارفتگی میں اسے ہوش ہی نہیں رہتا کہ پاؤں چادر سے باہر نکل چکے ہیں۔ جسے وہ بعد میں جھیلتا رہتا ہے مگر بچوں کی خوشی اور کامیابی پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرتا۔ یہ ایثار اور قربانی وہ اس والہانہ جذبے سے مغلوب ہو کر کرتا ہے جو خدا نے اس کے دل میں جاگزیں کیا ہوتا ہے۔اس میں والدین کی اپنی خوشی اطمینان اور سکون قلب ہوتا ہے اولاد پر احسان کی نیت نہیں ہوتی کیونکہ بچوں کو وہ اپنی ملکیت، دولت اور جائیداد سمجھتے ہیں اور ان پر حاکمیت کے زُعم میں رہتے ہیں۔لیکن جب بچے جوان ہوتے ہیں تو لامحالہ ان کی اپنی رائے، پسند، سوچ، نقطہ نظر اور تغیر زمانہ آڑے آتا ہے اور اس حقیقت کو قبول کرنیکی بجائے والدین اپنے خوابوں کے محل میں دراڑیں محسوس کر کے شکوہ گو ہو جاتے ہیں اور اپنی قربانیاں اور احسانات جتانا شروع کر دیتے ہیں، حالانکہ والدین اور اولاد کا ایک دوسرے پر احسان نہیں ہوتا اس لئے جتا کر اپنے آپ کو ہلکا کرنے کے مترادف ہے۔والدین کی مہربانیوں، قربانیوں اور احسانات کا کوئی نعم البدل نہیں۔ان کی عنایات جانفشانیوں اور خدمات کے سب معترف ہیں۔اس لئے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ناراض یا مایوس ہونے کی بجائے اعتماد اور اعتبار کر کے ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھ کر مسئلے حل کرنیکی کوشش کریں گے تو باہمی عزت و احترام کی فضا گھر کے ماحول کو پرسکون اور مہذب بنا دے گی۔

بلاشبہ اولاد بھی اپنے والدین سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ان کی خوشیاں تمنائیں اور خواب انہیں سے جڑے ہوتے ہیں اور اپنے تئیں ان کو راضی رکھنے اور خدمت کرنے کی بھرپور کوشش بھی

کرتے ہیں۔ البتہ اختلاف رائے پر بحث وتکرار کرتے وقت بعض بچے والدین کے رتبے اور احترام کو اہمیت نہ دیتے ہوئے بے ادبی کے مرتکب ہو کر انہیں دکھی اور غمگین کر دیتے ہیں ۔ یادرکھیں ! بیماریاں صرف بڑھاپے ہی نہیں بلکہ بچوں کی بے اعتناہی ،لاتعلقی و عدم توجہی، دلآزاری اور منفی رویوں کے علاوہ بے حسی اور بے رغبتی کی وجہ سے لاحق ہو جاتی ہیں۔ والدین بالخصوص والدہ کو راضی رکھنا اتنا آسان ہوتا تو جنت قدموں میں ہونے کا اعزاز وعظمت کی حقدار نہ ہوتی۔ ساری کائنات کو عبادات واخلاقیات کا درس جنت کے حصول کیلئے دیا اور جنت ماں کے قدموں میں رکھ دی۔ والدین کی خدمت واحترام فرض کی بجائے شوق چاؤ اور جذبہ ایثار کے تحت کریں۔ کیونکہ جو کام محض فرض اور ذمہ داری سمجھ کر کئے جاتے ہیں ان میں محبت ، دردمندی، وارفتگی اور والہانہ پن نہیں ہوتا۔ جیسے نوکری وغیرہ ہم صرف فرض سمجھ کر کرتے ہیں جوش اور ولولہ سے کریں تو ٹائم ختم ہونیکا انتظار نہ کریں۔ والدین کی کمی اور ضرورت کا احساس ان کے دینا سے جانے کے بعد شدید تر ہو جاتا ہے۔ بالخصوص اگر بچپن میں خدانخواستہ والد کا شفیق اور گھنا سایہ سر سے اٹھ جائے تو عزیز ورشتہ داروں کی نظر میں اس خاندان کی اہمیت اور درجہ زمین بوس ہو جاتا ہے۔ بجائے دلجوئی، ڈھارس اور محبت سے گلے لگانے کے بجائے الٹا ان کو اپنے سے دور کر دیتے ہیں اور اپنے منفی رویوں سے باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اب تمہارا مقام اور معیار وہ نہیں رہا جس پر ہم متمکن ہیں ۔ ہر موقع و ہر لحظہ ان کی بے بسی اور محرومیوں کا احساس دلاتے رہتے ہیں اور اس مجبور خاندان کو مزید کمزور کرنے اور اپنے زیر اثر لانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں وہ سر اٹھا کر ہمارے مقابل نہ آجائیں۔ اسی لئے ان کی خوشی اور کامیابی پر بھی تمسخر اڑا کر ان کی حیثیت یاد دلانے کی سعی کرتے ہیں تاکہ جوان ہونے پر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صورت میں بدلہ لینے کی نہ ٹھان لیں ۔ چونکہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے اس لئے ایسے بد

فطرت، خاموشی سے ذلت اور رسوائی کی گہری کھائی میں گر کر انجام کو پہنچ جاتے ہیں اگر چہ خوفِ خدا رکھنے والے رحمدل، عزیز، رشتہ دار اپنی باہیں وا کر کے اپنا شفقت بھرا ہاتھ سر پر رکھ کر طفل تسلیاں بھی دیتے ہیں۔مگر باپ جیسی حدت اور بے لوث جذبوں سے مزین گھنا سایہ تو میسر نہیں ہوسکتا جو باعث فخر و وقار، اعتماد، شان، طاقت اور سکون قلب ہو اس لئے اپنے سر پر والدین کا سایہ غنیمت جان کر ان کی قدر و منزلت اور رتبہ پہچان کر ان کی محبت اور زندگی کی دعائیں مانگیں۔ کیونکہ جو دعا بچے والدین کیلئے مانگتے ہیں وہ دراصل اپنے لئے ہی کر رہے ہوتے ہیں کیونکہ والدین کی سلامتی اور اطمینان میں ہی اولاد کی فلاح کامیابی، خوشی اور بقاء ہے۔

سیاسی گراوٹ:

ہمارے سیاستدان تقریروں اور ٹی وی پر بیٹھ کر اپنے قائدین کی نام نہاد قربانیاں اور احسانات جتا رہے ہوتے ہیں جبکہ ان کو قربانیاں ملک یا عوام کیلئے نہیں بلکہ سراسر اقتدار کے حصول کیلئے دینی پڑ جاتی ہیں۔ کیونکہ جہاں ان کو اپنی جان کا ایک فیصد بھی خطرہ ہو وہاں سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ لیکن ان کے قریبی رشتہ دار اور حواری، حقیقت آشنائی کے باوجود محض اقتدار کی لالچ میں اپنے نام نہاد لیڈروں کی نام نہاد قربانیوں کا یوں ذکر کر رہے ہوتے ہیں جیسے سننے والوں کو ان کی منافقانہ باتوں کا یقین ہو۔ جبکہ وہ انکا تمسخر اڑا رہے ہوتے ہیں بالخصوص پارٹیاں بدلنے والے شرمناک حد تک اس پارٹی کے سربراہ کے گن گا رہے ہوتے ہیں جس کو چند دن پہلے گھٹیا، مفاد پرست اور کرپٹ انہی ناظرین اور سامعین کے سامنے ثابت کر چکے ہوتے ہیں۔عوام دوسرے تیسرے درجے کے ان لیڈروں کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا دیکھ کر ہکا بکا ہو کر انکی ڈھٹائی کا ماتم کر رہے ہوتے ہیں کیونکہ اُن کا مقصد سچائی اور حقیقت بیان کرنا نہیں بلکہ اپنے قائدین کا جھوٹا اور حقائق کے برعکس دفاع کرنا ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ اُن کے ساتھ بھی مخلص نہیں ہوتے بلکہ ان کی وجہ سے

ملنے والی مراعات، عہدے اور وزارتوں کا لالچ پیش نظر ہوتا ہے۔ اس لئے اپنے لیڈران کو خوش کرنے کی کوشش میں ٹاک شوز میں بدتمیزی اور گالم گلوچ سے بڑھ کر بات ہاتھا پائی تک پہنچ چکی ہے جس کا تماشا پوری قوم دیکھ کر شرمندہ بھی ہوتی ہے اور دنیا میں جگ ہنسائی بھی ہوتی ہے۔ جبکہ کچھ اچھی شہرت والے با صلاحیت سیاست دانوں نے اپنے طور پر بھی نام کمایا ہے جن میں سرِ فہرست جاوید ہاشمی جیسے نڈر، بے لوث، بے داغ اور با کردار کے علاوہ اسد عمر اور احسن اقبال جیسے پڑھے لکھے اور سلجھے، شاہد خاقان عباسی جیسے سیدھے سادھے اور وفادار سیاستدان ہیں۔ جبکہ خواتین میں روبینہ خالد، ثمینہ خالد گھرکی جیسی سلجھی، باوقار اور نصرت سحر عباسی جیسی بے باک اور مضبوط کردار کی مالک اور مہتاب اکبر راشدی جیسی ہمہ جہت صلاحیتوں سے بھرپور، اگرچہ وہ اسمبلی میں اتنی فعال نہیں کیونکہ انکا اصل شعبہ تدریس وفنون لطیفہ ہے اس لئے بہتر ہے کہ سیاست میں وقت ضائع کرنے کی بجائے اپنی دلچسپی اور متعلقہ شعبہ میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائیں۔

صحت و صفائی :

حدیث رسول ﷺ کے مطابق صفائی نصف ایمان قرار پانے کے بعد اس کی اہمیت و افادیت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ اپنے آپ اور اردگرد کے ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کے کئی فائدے ہیں۔ مثلاً انسان کا امیج بہتر ہونے کے ساتھ ساتھ صحت، سلیقہ، خوبصورتی، اطمینان و سکونِ قلب اور ثواب بھی ہے۔ صفائی کے ساتھ دانتوں کا گہرا تعلق ہے عام طور پر صبح اٹھ کر ٹوتھ برش کرنیکا رجحان ہے۔ اس طرح ہم ساتھ ہی ناشتہ کر کے دانت پھر گندے کر لیتے ہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ رات کو سونے سے قبل برش کریں تا کہ رات بھر دانت صاف رہنے کی وجہ سے سانسیں بھی ستھری لیں اور اس طرح معدے پر بھی صحت مند اثرات پڑتے ہیں۔ صبح اٹھ کر صرف

کلی کر کے ناشتہ کریں اور بعد میں برش کریں اور کوشش کریں کہ زیادہ دیر تک دانت صاف رہیں۔ اس ضمن میں ایک اور خاص بات کا خیال رکھیں کہ کھانے یا پینے کے فوراً بعد کلی یا برش نہ کریں یعنی چائے اور کھانے سے دانت گرم اور کولڈ ڈرنک وغیرہ سے ٹھنڈے ہونے کی صورت میں اتنا انتظار کریں کہ دانت نارمل حالت میں آ جائیں۔ تا کہ دانتوں کی حساسیت کی وجہ سے مضر اثرات نہ ہوں۔ اسی طرح کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا جتنا ضروری ہے اتنا ہی بعد میں بھی، ٹشو یا رومال سے مطلوبہ صفائی ممکن نہیں۔ جرابیں، جوتے پہننے اور کنگا یا ہیئر برش استعمال کے بعد پھنسنے والے بال نکال کر ضرور ہاتھ دھوئیں۔ اسی طرح ایک اور غلط روٹین کھانے کے بعد پانی پینے کی ہے۔ حالانکہ تحقیق کے مطابق پہلے پینا بہتر ہے جبکہ کھانے کے تقریباً 40 سے 50 منٹ کے بعد پانی پیئں وہ بھی زیادہ ٹھنڈا نہ ہو۔ جتنا پانی زیادہ ٹھنڈا ہوگا اتنا ہی نقصان دہ بھی ہوگا۔ اگر چہ زیادہ گرمی میں نارمل پانی پینا مشکل ہوتا ہے لیکن کم از کم کھانے کے بعد یا ادویات کے ساتھ زیادہ ٹھنڈا نہ ہو۔ صبح و شام سیر کی عادت بنائیں زیادہ نہ سہی پورے دن میں ایک گھنٹہ تو صحت کیلئے وقف کریں۔ خالی پیٹ جاگنگ تیز اور کھانے کے بعد آہستہ کریں۔ بغیر بھوک کھانا نہ کھائیں لیکن بھوک لگنے پر دیر نہ کریں۔ بہت زیادہ کھانا اور ثقیل کھانے سے پرہیز کریں۔ دال اور سبزی گوشت سے بہتر ہے وہ بھی بھوک رکھ کر کھائیں۔، رات کو جلد سونے کی عادت اپنائیں۔ رات کے کھانے کے تقریباً تین گھنٹے بعد سوئیں۔ یعنی کھانا جلدی کھائیں گے تو جلدی سوئیں گے جبکہ نوجوان رات بھر جاگتے اور فجر کے وقت جب جاگنے کا وقت ہوتا ہے تب سوتے ہیں۔ حالانکہ خدا نے رات سونے اور دن جاگ کر معمولات زندگی ادا کرنے کے لئے بنایا ہے۔ خلاف فطرت چلنے سے تو سراسر نقصان ہے۔ دن کے چار گھنٹے سے رات کو دو گھنٹے سونا بہتر ہے۔ اگر چہ عمر کے حساب سے آئیڈیل دورانیہ رات کو تقریبا 5 سے 10 گھنٹے سونا ہے۔ جلدی سونے

اور جلدی اٹھنے میں صحت بھی ہے برکت بھی۔ جیسے حدیث رسول ﷺ بھی ہے کہ پہلے ٹائم میں برکت اور نفع ہے چاہے کاروبار ہو یا معمول کے کام ہوں۔ حسب استطاعت موسمی فروٹ بھی درکار وٹامنز کیلئے ضروری ہیں۔ اس میں بھی آخری کی بجائے شروع موسم کے پھل صحت پر بہتر اثرات مرتب کرتے ہیں۔ پلاسٹک کے برتن اتنے عام ہو گئے ہیں کہ چھٹکارہ ممکن نہیں لیکن تھوڑی سی احتیاط کر کے ان کے استعمال کے مضر اثرات کم کر سکتے ہیں۔ مثلاً ان میں گرم چیزیں جیسے کھانا، چائے، گرم پانی ہرگز نہ ڈالیں۔ صرف ٹھنڈی اشیاء جیسے ٹھنڈا پانی، برف آئس کریم یا فریج میں برف جمانے کیلئے بہتر ہیں۔ اس طرح شاپنگ بیگ بھی جتنا نقصان دہ ہیں اتنے ہی ضروری بھی ہو چکے ہیں۔ اسکا بھی توڑ یہ ہے کہ خریداری کے بعد گھر آ کر سبزی، فروٹ، گوشت وغیرہ فوراً نکال لیں بالخصوص گرمیوں میں خراب ہونے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ سردیوں میں اگر کھانے پینے کی چیزیں ایک دو دن میں استعمال کرنا ہوں تو فریج میں رکھ کر ان کی تازگی ختم نہ کریں۔ ہاں اگر بچ جائیں یا زیادہ مقدار میں خرید لی ہیں تو فریج میں رکھنا بہتر ہے لیکن زیادہ دن فریج یا ڈیپ فریزر میں رکھنے سے بھی چیزیں نا صرف بدذائقہ بلکہ مضر صحت بھی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کھانے پینے کی اشیاء فریج میں ہوں یا کچن وغیرہ میں ڈھانپ کر رکھیں خصوصاً رات کو تو اسکا اہتمام ضرور کریں۔ بالفرض ڈھکن میسر نہ ہو تو فریج کے اوپر والے خانے میں رکھیں کیونکہ نیچے کھلا رکھنے سے اوپر والے خانے سے میٹریل نچلے برتنوں میں گرنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ سٹیل یا پیتل سے بہتر ہے کانچ یا مٹی کے برتن استعمال کریں۔ ان میں بھی گلاس یا کپ چوڑے پیندے والے ہوں تا کہ صفائی کرتے نیچے تک ہاتھوں کی رسائی آسان ہو۔ کھانا تیار ہونے پر سب گھر والے اکٹھے کھائیں تو بے شمار فائدے اور اس کے برعکس نقصانات مثلاً تازہ اور گرم کھانے کا ذائقہ اور غذائیت بھی بھرپور، برکت اور محبت کے حصول سے صحت پر مثبت اثرات

کیساتھ مہذب روایات کا حسین مظاہرہ۔ جبکہ الگ الگ کھانے سے عورتوں کی خفت اور مزاج میں چڑچڑا پن اور بار بار گرم کرنے سے غذائیت میں کمی کے علاوہ گیس، بجلی کا غیر ضروری استعمال بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اوون میں درکار وقت سے زیادہ گرم ہونے پر ٹھنڈا ہونے کا انتظار اور بے خبری یا بے صبری میں زبان جلنے کا اندیشہ۔ یعنی نقصان در نقصان، پھر بدمزگی، بے برکتی اور وقت کا ضیاع، عورتوں کے طعنے تشنے الگ، کیونکہ غلط کام کے ایک نہیں کئی نقصانات ہوتے ہیں۔ جیسے مذکورہ بالا کے علاوہ اگر کھانا پینا ٹیک لگا کر یا لیٹنے کے انداز میں کھائیں تو کپڑوں کو داغ کا امکان، حفظانِ صحت کے بھی خلاف، دیکھنے میں بھی غیر مہذب اور معیوب لگتا ہے۔ اسی طرح سب سے زیادہ لا پرواہی دودھ ابالنے میں ہوتی ہے۔ یعنی دودھ ضائع اور چولہا بھی گندا ہو جاتا ہے جبکہ قریب کوئی ہو تو اس کی تلخ باتیں بھی سننا پڑتی ہیں۔ کوئی درگزر بھی کر جائے تو کھیسانہ تو ہونا ہی پڑتا ہے یعنی سمجھداری اور بروقت کام کے فائدے ہی فائدے جبکہ لا پرواہی، غیر ذمہ داری اور بدنظمی کے نقصان ہی نقصان ہیں۔ تھوڑی سی سوچ، احساس اور سوجھ بوجھ سے سگھڑ جبکہ بے ترتیبی، سستی اور کاہلی سے پھوہڑ کہلائیں گی۔ یعنی کھانے کے بعد دیر سے بھی برتن خود اٹھانے ہیں تو جلدی کیوں نہ سمیٹیں۔ ملازم کا انتظار ہے تو کم از کم کچن میں پھیلانے کی بجائے سنک ٹب وغیرہ میں برتن رکھنے میں ایک دو منٹ ہی لگتے ہیں۔ گھر میں صفائی اور خوشگوار ماحول بھی ہوگا۔ گھر ہمیشہ صاف رہنا چاہیئے۔ یہ نہیں کہ مہمانوں کی آہٹ پر فوراً بکھری اشیاء بیڈ یا صوفوں کے نیچے دھکیل دیں اور ان کی غلط فہمی پہ مبنی تعریف پر خوش فہمی میں مدہوش و مسحور ہونیکی بجائے حقیقت کا ادراک کر کے اپنی اصلاح کریں۔ صفائی کو برقرار رکھنا بلا تفریق جنس، گھر کے تمام افراد کی ذمہ داری ہے یعنی استعمال شدہ برتن، راستے میں پڑے چھلکے و کاغذ، چپل یا کپڑے وغیرہ اٹھا کر مختص جگہوں پہ رکھنے کی عادت ہونی چاہیئے۔ جبکہ ان معمولی مگر

مؤثر کاموں میں زیادہ وقت بھی نہیں لگتا۔صرف سوچ اور فکر کی ضرورت ہے۔محض قیمتی فرنیچر، پردے، قالین اور ڈیکوریشن پیس ہی خوبصورتی و ذوق کے آئینہ دار نہیں کیونکہ آرائشی اشیاء کے باوجود بھی صفائی، قرینہ اور ترتیب کا فقدان ہو تو مطلوبہ مقصد پورا نہیں ہوگا۔جبکہ عام سا آرائشی سامان، فرنیچر بھی طریقے سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہو اور صفائی برقرار رہے تو زیادہ پرکشش اور جاذبِ نظر لگتا ہے۔یعنی حقیقی خوبصورتی صرف قیمتی اور بڑھیا اشیاء میں نہیں بلکہ طریقہ سلیقہ، صفائی اور نظم میں ہے جس سے خوشگوار ماحول جنم لیتا ہے۔نفع نقصان، نیکی بدی، صفائی و گندگی کا شعور و ادراک ہونے کے باوجود اگر اس کے برعکس ہو جائے تو افسوس نہیں کرنا چاہیئے۔یعنی احتیاط کے باوجود کوئی برتن ٹوٹ جائے رقم گم ہو جائے یا گر جائے حتیٰ کہ چوری بھی ہو جائے تو غمگین یا پریشان نہ ہوں کہ بعض اوقات نقصان میں امتحان بھی ہوتا ہے۔بس ہمیں اپنے تئیں احتیاط، ہوشمندی اور سمجھداری کا وطیرہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔مثلاً نماز کیلئے مسجد جانا چاہتے ہیں مگر بارش یا خرابی موسم کی وجہ سے ممکن نہ ہو تو جیسے خدا کوشش اور نیت جانتے ہوئے معاف کر دیتا ہے اسی طرح کسی کی لاپرواہی اور غیر ذمہ داری کی وجہ سے معمولی نقصان قابل افسوس و مذمت ہے جبکہ محتاط اور چوکس رہنے کے باوجود بڑا نقصان بھی ہو جائے تو خدا کی رضا پر راضی مطمئن رہیں۔

پاکستانیت :

وطن سے محبت ہر محبّ وطن کے ایمان کا حصہ ہوتی ہے اور جس سے محبت ہو اس سے وفاداری کا تقاضا ہے کہ اس کے وقار، تقدس، عزت و احترام پر آنچ نہ آنے دیں اور جذبہ حب الوطنی کے اظہار میں کنجوسی یا بخل کی بجائے قول و فعل سے عقیدت و محبت جھلکنا چاہیے۔کیونکہ وطن ایک گھر کی طرح ہوتا ہے جس طرح گھر کے افراد آپس میں لڑائی جھگڑا بھی کریں لیکن کسی غیر کو اپنے بہن

بھائیوں کے خلاف بات کرنیکی اجازت نہیں دیتے بلکہ اسے مداخلت پر ڈانٹ بھی دیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ گھر کے اندرونی اختلاف اور جھگڑوں سے دوسرے بے خبر ہی رہیں۔اسی لئے گھر میں جھگڑا ہو رہا ہو تو دستک ہونے پر سب فوراً یوں نارمل ہو جاتے ہیں گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ کیونکہ خاندان کی عزت اور توقیر کے معاملے میں سب یکساں ہوتے ہیں۔اسی طرح تنازعات اور شکایات کے باوجود ملکی وقار اور محبت پر سب کو متفق ہونا چاہیے۔ جبکہ اکثریت دوغلے پن کا شکار ہے۔یعنی وطن کی عظمت اور محبت کے گیت بھی گاتے ہیں اور اس کی خامیوں اور کمزوریوں کو چھپانے اور نظر انداز کرنیکی بجائے کھلے عام تحقیر و تذلیل کر کے تمسخر بھی اڑاتے ہیں۔جیسے کوئی ایماندار اہلکار ناجائز یا غلط کام سے انکار کرے یا اس کے برعکس جائز کام کے عوض افسر یا اہلکار رشوت طلب کرے تو سائل کے انکار پر بجائے شرم سے ڈوب مرنے کے ایک عام مروجہ جملہ کس دیتے ہیں کہ یہ پاکستان ہے سب چلتا ہے کس دنیا میں رہتے ہو۔اسی طرح بغیر رشوت یا سفارش نوکریوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔والدین اپنے خون پسینے کی کمائی سے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلا کر سہانے سپنے دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ جبکہ بدعنوان حکومتی نمائندوں اور ان کے حواریوں کے نااہل بچے، اہلیت اور میرٹ کی دھجیاں اڑا کر والدین کی کرپشن اور لوٹ کھسوٹ کو آگے بڑھانے کیلئے سفارش پر بھرتی ہو کر کے اداروں کو کھوکھلا کرنے کا تسلسل جاری رکھے ہوتے ہیں۔ باصلاحیت، اعلیٰ تعلیم یافتہ و ایماندار، پر جوش پر عزم و ملکی درد اور جذبہ رکھنے والے مایوس ہو کر بے راہ روی اور عدم تحفظ کا شکار ہو کر خودکشی تک مجبور ہو جاتے ہیں یا کر دیئے جاتے ہیں۔ والدین جو اپنے مستقبل کے اندھیرے دور کرنے کے لیے جو چراغ جلاتے ہیں ان کو بجھتا دیکھ کر بے بسی اور لاچاری کے سبب مختلف بیماریوں کا شکار ہو کر راہ عدم سدھار جاتے ہیں۔لیکن ان ظالموں کو احساس تک نہیں ہوتا کہ ان کے کالے کرتوتوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے کتنے گھر اجڑ

گئے اور کئی بے انصافیوں اور حکمرانوں کی مجرمانہ خاموشی کی نذر ہو گئے ۔اس معاشرتی بگاڑ اور عدم توازن کے ذمہ دار حکمرانوں کی بجائے ہم ملک کو بدنام کرتے رہتے ہیں بالخصوص غیر ملکوں میں آباد پاکستانی واپس تو وطن کی محبت میں آتے ہیں لیکن گُن غیروں کے گاتے ہیں کہ یورپ وغیرہ میں تو قانون ہے انصاف ہے خوشحالی ہے حالانکہ قانون تو تمام ممالک میں تقریباً ایک جیسے ہیں فرق صرف عملدرآمد کا ہے۔اسی عملداری کی وجہ سے وہاں کرپشن کم ہے ٹیکس وصولی تقریباً سو فیصد ہونے کی وجہ سے حکومتیں عوام کو سہولتیں بھی دیتی ہیں ۔ ہمارے ہاں اگرچہ ان آسائشوں کا فقدان ہے لیکن رشتوں کا تقدس واحترام اور احساس ذمہ داری خصوصاً عورتوں اور بزرگوں کی اہمیت وفوقیت کی پاسداری کی وجہ سے ہمارا ملک مثالی ہے۔یورپ میں تو بوڑھے والدین کو اولڈ ہوم میں اس وقت چھوڑ آتے ہیں جب آخری عمر میں انہیں بچوں کے سہارے اور دلجوئی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اُنہیں ملنے تک نہیں آتے اور وہ ان کی راہ تکتے تکتے اذیت ناک اور تکلیف دہ زندگی گزار کر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں ۔جبکہ ہمارے بزرگوں کو باعث رحمت و برکت اور دعاؤں کا ذریعہ ومنبع اور گھر کی زینت ورونق سمجھا جاتا ہے اور ان کی خدمت و رضا کو دنیا میں کامیابی و کامرانی اور آخرت میں باعث فلاح ونجات سمجھتے ہیں۔ یہ ہمارے مذہب، ملک اور کلچر کی خوبصورتیاں ہیں جنہیں غیروں میں اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔دنیا میں کوئی ایسا خطہ نہیں جہاں خوبیاں ہی خوبیاں یا ساری خامیاں یا جرائم ہوں ۔اس لئے حب الوطنی ،وفاداری اور غیرت وحمیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اپنی خوبیوں اچھائیوں اور کامیابیوں اور غیروں کی خامیوں، برائیوں اور کمزوریوں کو اجاگر کیا جائے اور قول وفعل سے ملکی محبت،عقیدت اور احترام کا اظہار ہو تا کہ دنیا کو ہمارا اُس مقام،عزت، وقار اور امیج کا پیغام جائے جس کا پاکستان اور ہم پاکستانی حقدار ہیں۔

فلسفہ عبادت:

کسی ہستی کو مسیحا اور نجات دہندہ مان کر اس کی تعظیم و تکریم اور عقیدت کے اظہار کیلئے اس کے سامنے جھکنا اور اپنی حاجات کیلئے دامن پھیلا کر مدد چاہنا انسانی جبلت میں شامل ہے۔ تمام ادیان کے پیروکار اپنی اپنی عبادتگاہوں میں یہی کچھ کرتے ہیں۔ طریقے مختلف سہی مگر مقصد عبادت و پوجا اور دکھوں، پریشانیوں، محرومیوں کا مداوا اور خوشیوں، خوشحالیوں کامیابیوں کامرانیوں اور راحت وسکون کا حصول ہے۔ قبولیت نہ بھی ہو، تسکین تو ہو جاتی ہے۔

ہمیں اپنی اصلیت اور حقیقت پر فخر ہونا چاہیے چونکہ ہم مسلمان ہیں تو ہمیں طور طریقوں، قول و فعل، سوچ انداز، رہن سہن، گفتگو، معاملات، کھانے پینے، سونے جاگنے، لباس اور اوڑھنے بچھونے سے مسلمان نظر آنا چاہیے۔ اسلام صرف عبادات تک ہی محدود نہیں بلکہ مکمل ضابطہ حیات ہے۔ فرائض کی ادائیگی کے تو مخصوص اوقات یا مواقع ہیں لیکن روزمرہ کے معمولات یعنی لین دین، کھانا پینا، دائیں ہاتھ سے بلکہ لباس مثلاً قمیض، شلوار یا پتلون، جرابیں حتیٰ کہ جوتے بھی دائیں طرف سے پہننا، دائیں کروٹ سونا بڑوں کے احترام میں کھڑے ہونا، انہیں جگہ دینا، سلام میں پہل کرنا اگرچہ اجنبیوں کیلئے دل میں خاص جذبہ نہیں ہوتا لیکن سلام کرنے سے محبت و احترام کا رشتہ و جذبہ قائم ہو جاتا ہے۔ لباس بالخصوص عورتوں کے فیشن کا معیار عریانی قرار پایا ہے یعنی جتنا مختصر لباس پہنے گی اتنی ہی ماڈرن اور ایڈوانس کہلانے کی حقدار ہوگی اور جتنی باپردہ و باحیا ہوگی اتنی ہی دقیانوسی و غیر ترقی یافتہ اور بدذوق کا لقب ملے گا۔ اسی طرح پھٹی جینز بھی ذوقِ معیار و فیشن کی انتہا ٹھہری۔ اس لئے فیشن کے اس گمراہ کن اور بیہودہ تصور کی بجائے روایتی مذہبی شعار، سوچ اور مناسب طرز لباس و افکار اپنا کر مسلمانوں کی طرح نظر آئیں۔ خدا نے عبادات اخلاقیات اور بھلائی کا درس انسان کے فائدے کیلئے دیا ہے کیونکہ کسی کی گمراہی یا نافرمانی سے خدا

کی خدائی کو کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ خدائی احکامات پر عمل کرنے سے نہ صرف آخرت میں اجر و ثواب و درجات بلکہ دنیا میں بھی عزت و احترام، مقام، لطف و کرم، تحسین و تعریف کے علاوہ صحت مند خوشحال اور پرسکون زندگی کے حصول کا ذریعہ بھی ہے۔ مثلاً نماز اگرچہ ہم فرض کی ادائیگی کیلئے پڑھتے ہیں لیکن خدا نے اس میں بے شمار فوائد و انعامات اور حکمتیں رکھی ہیں جن کا احاطہ انسانی قلم کے بس میں نہیں پھر بھی چند کرامات کی مثالیں سمجھنے کی ضرورت ہے جیسے نمازی، پاک و صاف ستھرا رہتا ہے جس سے نصف ایمان تو پا ہی لیتا ہے وقت کی پابندی کی عادت اور مسجد آنے جانے اور نماز کو مکمل تقاضوں کے ساتھ ادا کرنے کی وجہ سے جسمانی صحت و تندرستی بھی، جو کہ رکوع و سجود اور قیام کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے اس کے علاوہ معاشرے میں نمازی کا مقام و عزت و توقیر اور احترام میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کی برائیوں اور گناہوں کے باوجود داد و تحسین ملتی ہے۔ بالخصوص نوجوان ہو تو اس کی مثالیں دی جاتی ہیں اسے پرہیزگار اور قابل بھروسہ سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح نمازی کی خامیاں نظر انداز اور خوبیاں اجاگر ہو جاتی ہیں۔ دوستوں کی محفل میں فضول اور لغو گفتگو، نماز کی وجہ سے ترک کرنا پڑتی ہے۔ جیسے قرآن میں بھی ہے کہ نماز بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے۔ اس طرح کی لاتعداد مثالیں دی جاسکتی ہیں جن سے نماز کی اہمیت و برکت اور انسانی زندگی پر مثبت اثرات کی غمازی ہوتی ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی سے جہاں فرض ادا ہوتا ہے وہاں لینے والے مشکور ہو کر دعائیں بھی دیتے ہیں اور جگہ جگہ اس کی غریب پروری، رحمدلی اور ہمدردی کے چرچے بھی کرتے ہیں۔ اس طرح معاشرے میں باعزت مقام کے علاوہ مال پاک و محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ کئی گنا بڑھتا بھی ہے جیسا کہ اللہ نے وعدہ فرمایا ہے۔ قلبی سکون و اطمینان حاصل ہونے سے صحتمندانہ اور خوشگوار اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ پھر روزے میں بھی بے پناہ حکمتیں اور روحانی و جسمانی فوائد ہیں۔ جیسا کہ

حدیث رسول ﷺ ہے کہ روزہ جسم کی زکوۃ ہے کیونکہ سال بھر ہم جوطرح طرح کی غذائیں کھاتے رہتے ہیں روزہ رکھنے کی وجہ سے معدے اور آنتوں کوافاقہ ملنے سے انسانی صحت پر منفی اثرات ختم ہوکر مثبت اور توانا اثرات مرتب ہونے سے بیماریوں سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ یہ واحد عبادت ہے جس میں دکھاوا یا ریاکاری نہیں۔ چونکہ بندے کا راز داں صرف اللہ ہے اس لئے خدا نے اس کے اجر وثواب کی کوئی حد مقرر نہیں کی۔ یعنی بے پایاں انعام واکرام کا حقدار ٹھہرایا ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کا ہی کمال ہے کہ انسان کی وہ خوبیاں، خوبصورتیاں اور صلاحتیں اجاگر ہو جاتی ہیں جن کا عام دنوں میں احساس وادراک نہیں ہوتا۔ سب سے بڑی اور قابل فخر بات یہ کہ رضاءالٰہی کیلئے صبر و برداشت، نظم وضبط، پرہیزگاری اور پاکیزگی کا بے مثال و باکمال مظاہرہ دنیا میں کسی قانون، روایات، عبادات وفرائض کی ادائیگی میں دیکھنے میں نہیں آتا۔ پھر قوت ارادی کا پرعزم وبھرپور اظہار جیسے کھانے پینے کے علاوہ انواع واقسام کے پھل، جوس طرح طرح کے لوازمات بھی سامنے موجود اور بھوک و پیاس کی شدت بھی، دنیاوی طاقت بھی رکاوٹ نہیں لیکن خدا کی خوشنودی اور رضا کیلئے ہم صبر و برداشت کا دامن نہیں چھوڑتے۔ اس کے علاوہ عام دنوں میں فجر کی نماز کیلئے اٹھنا بھی محال ہوتا ہے جبکہ رمضان میں فجر سے بھی دو تین گھنٹے پہلے اٹھ جاتے ہیں جبکہ آدھی نیند بھی نہیں سو سکتے۔ پھر خواتین جس جذبہ ایمانی سے اپنی اور گھر والوں کی سحری کا اہتمام کرتی ہیں وہ نظم وضبط کی اعلیٰ مثال ہے۔ پھر افطاری کی بروقت تیاری عورتوں کے طریقہ سلیقہ وشعور اور خدمت کے اعلیٰ جذبے کی عکاسی ہے۔ اسی طرح مرد بھی روزے کے باوجود ملازمت، کاروبار یا مزدوری کے دوران سارا دن دھوپ چھاؤں یا سفر کی مشکلات وصعوبتیں صرف خدا کی خوشنودی و رضا کی خاطر برداشت کر کے قوت ایمانی کا عظیم مظاہرہ کرتے ہیں۔ کامیاب زندگی کا ایک راز پابندیٔ وقت ہے جس کی مثال رمضان کے علاوہ

کسی مقام وموقع پر نہیں ملتی۔جیسا کہ عام دنوں میں دعوتیں اور تقریبات مقررہ وقت سے کئی کئی گھنٹے دیر سے شروع ہوتی ہیں پھر بھی افراتفری، ہنگامہ اور بدنظمی رہتی ہے۔جبکہ دعوت افطار میں جس طرح سارا انتظام واہتمام بروقت ہوجاتا ہے وہ انسان کی صلاحیت اور اہلیت کا مظہر ہے جو صرف روزے کی وجہ سے اجاگر ہوتا ہے۔روزوں کے ساتھ ساتھ عید کی تیاریاں، جو بالخصوص آدھے رمضان کے بعد عروج پر پہنچ جاتی ہیں بازاروں میں رونقیں اور فضا برکتوں سے معطر ہو جاتی ہے۔

کاروبار میں اضافہ اور عید کی چھٹیوں کے احساس سے چہروں پر اطمینان ومسرت کے اثرات سے ماحول خوشگوار اور جاذب نظر ہوجاتا ہے۔مالی مسائل کے باوجود والدین بچوں کی خوشی کی خاطر جوش وخروش سے خریداری کرتے ہیں آخری ہفتہ میں رحمتوں، فضیلتوں ونظم وضبط سے مالا مال بابرکت رمضان کی رخصتی کا ملال اور عید کی آمد کے خوشگوار اور روح پرور احساس کے امتزاج سے ماحول میں منفرد سی سرمستی چھاجاتی ہے۔پھر روزہ کے صلے میں عید پر درودیوار سے چھلکتی خوشی اور نئے لباس کیساتھ عید کی نماز پڑھنا اور دوستوں رشتہ داروں سے ملنے سے روح تک معطر ہوجاتی ہے۔بچھڑنے والے پیاروں کی قبروں پر جانے کی فکر انگیز ریت تجدید وفا اور دلی سکون وراحت کی آئینہ دار ہے۔اس اخوت ویگانگت اور رواداری سے دل خوشیوں اور محبتوں سے معمور ہوکر نرم اور فراخ ہونے سے ناراضگیاں دور ہوکر صلح وآشتی کا پرکشش اور دلفریب ماحول وجود میں آتا ہے جس سے دنیا میں مسلمانوں کے مذہبی تہواروں کی افادیت واہمیت اور ضرورت اجاگر ہوکر ایک مثبت، مؤثر اور عظیم پیغام جاتا ہے۔

حج کے موقع پر دنیا کا سب سے بڑا عظیم الشّان اور روح پرور اجتماع اسلام کی قوت وہیبت اور نظم و ضبط کا عکاس ہے جب مسلمان اپنی ذات کی نفی کر کے خدا کے حضور سجدہ ریز ہوکر اس کی کبریائی

اور بڑائی کا اقرار اور وحدانیت کا اظہار کر کے دنیا کو پیغام دیتے ہیں کہ خدائے بزرگ و برتر کے سوا ہمارا کوئی معبود نہیں۔ اسی کی عبادت کرتے اور اسی سے مدد چاہتے ہیں اور دنیاوی خود ساختہ اور بے لگام طاقتوں سے امید و توقع نہیں رکھتے۔ اس اقرار و اعتراف اور خدا پر کامل ایمان و یقین سے اس کی رحمت، جوش میں آجاتی ہے اور حسبِ وعدہ وہ تمام حاجیوں کے گناہ معاف کر کے نئے صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی گزارنے کا موقع دیتا ہے۔ سنت ابراہیمی یعنی قربانی کی ادائیگی سے غریبوں محتاجوں اور مسکینوں کو پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہوتا ہے اور وہ جی بھر کر دعائیں دیتے ہیں۔ یعنی دعاؤں کا یہ سلسلہ جو روضہ رسول پر حاضر ہونے کی دیرینہ آرزو پوری ہونے پر بام عروج تک پہنچ جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں جب اپنی حاجات و خواہشات کیلئے ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں تو رحمت العالمین کے در سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔

عدل اور عدلیہ :

دنیا میں ترقی یافتہ قوموں کی ترقی و خوشحالی، شعور، تحفظ، اعتماد اور امن و سکون کی ایک ہی وجہ ہے کہ ان کے حکمرانوں نے انصاف کا نظام رائج کیا ہے۔ حضرت علیؓ کا خوبصورت اور مشہور قول ہے کہ کفر کا نظام تو چل سکتا ہے ظلم کا نہیں۔ اس لئے جس نے انصاف کا دامن پکڑ لیا فلاح پائی۔ اگرچہ بعض ممالک نے اپنے عوام اور اندرونی طور پر تو انصاف روا رکھا مگر بین الاقوامی سطح پر اجارہ داری قائم کرنے کیلئے دوسرے ممالک میں بے جا مداخلت کر کے انہیں محکوم رکھنے کی ناجائز کوششیں کرتے ہیں۔ اس سے ان کا مکروہ چہرہ بے نقاب ہو کر دھرا معیار سامنے آجاتا ہے۔ اسی لیے اپنی عوام کو انصاف دلانے کے باوجود دنیا میں انہیں نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یعنی جہاں انصاف مہیا کرتے ہیں وہاں عزت بھی پاتے ہیں لیکن جہاں بے انصافیاں اور بدمعاشیاں کرتے ہیں ان کی نظروں میں ذلیل و رسواء ہوتے ہیں۔ گویا عزت اور ذلت کا معیار انصاف

ٹھہرا۔

ہمارے ہاں معاشرتی بگاڑ، وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم اور بیروزگاری بالخصوص اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی مایوسی کے نتیجے میں بے راہروی وعدم برداشت سے جنم لینے والی دشمنیاں نتیجتاً قتل و غارت کے لامتناعی سلسلے، چور، ڈاکو اور لٹیروں کے خوف وحکومتی اہلکاروں اور عوامی نمائندوں کے سدھائے ہوئے غنڈوں، بدمعاشوں کی کھلے عام للکار سے سہمی عوام کی کربناک اور مایوس کن صورت حال کی ایک ہی وجہ ہے۔ ناانصافی، اس لئے انصاف کی اہمیت وضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے عمران خان نے اپنی پارٹی کا نام ہی تحریک انصاف رکھا اور اسی بامقصد پرکشش اور پرعزم نعرے کو ہی عوام نے اپنی عزت، وقار، فلاح، تحفظ وجائے پناہ اور بقاء سمجھ کر کامیابی سے ہمکنار کروایا۔ اب حکومت کا فرض ہے کہ اس کے دکھائے ہوئے خوابوں، امنگوں اور ارمانوں سے عوام نے جو چراغ جلائے ہیں اس کی روشنی کو مدھم نہ ہونے دے بلکہ ان کو مزید بڑھانے کیلئے فوری سستا اور آسان انصاف کی فراہمی کو یقینی بنائے تاکہ ظلم کی چکی میں پسے عوام سکھ کا سانس لیں۔ انصاف مخصوص افراد یا مخصوص حالات نہیں بلکہ سب کو یکساں اور ہمیشہ میسر ہونا چاہیے۔ کیونکہ بعض مقدمات تین سے چار دھائیوں تک چلنے کے باوجود بھی فیصلے نہیں ہوتے جبکہ بعض چند مہینوں میں نپٹا دیے جاتے ہیں۔ جس سے سوالات اٹھتے ہیں ویسے تو کسی بھی فرد یا ادارے کے خلاف ازخود نوٹس لینے کا اعلیٰ عدالت کا حق بھی ہے اور فرض بھی۔ لیکن آغاز اپنے گھر سے کرنے سے اثرات اور نتائج زیادہ مؤثر ہوتے ہیں۔ اس لئے ماتحت عدالتوں کی بے قاعدگیوں اور غیر ذمہ دارانہ رویوں کو درست کرنیکی ضرورت ہے۔ جہاں سائلین جائیں تو بڑی بے حسی سے کہا جاتا ہے کہ جج صاحب موجود نہیں استفسار پر شانِ بے نیازی سے جواب ملتا ہے کہ معلوم نہیں آئیں گے بھی یا نہیں۔ ذرا تصور کریں ایک غریب سائل جو روزانہ کی بنیاد پر مزدوری کر کے پانچ

سات سو اجرت لے کر بمشکل گھر کا کچن چلاتا ہے وہ نہ صرف ایک دن کی اجرت سے محروم ہوتا ہے اُلٹا کرایہ خرچ کر کے سارا دن سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے عدالت آئے تو بیٹھنے کیلئے جگہ دینے کی بجائے یہ کہہ کر اس کی تھکن میں مزید اضافہ کر دیا جاتا ہے کہ آج جج صاحب چھٹی پر ہیں۔ ہر تاریخ پر اسی طرح کی وجوہات بتا کر سائلین کا وقت اور پیسہ برباد کر کے استحصال کیا جاتا ہے۔ بے انصافی تو عدلیہ کے غیر ذمہ دارانہ رویے اور عدم توجہی سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ اصل مقدمہ سے انصاف کی کیا توقع ہوسکتی ہے۔ انہی ظالمانہ اور بے رحمانہ رویوں کی وجہ سے سائلین دل برداشتہ ہو کر عزت اور مال وزر کا نقصان برداشت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ انصاف مانگتے مانگتے جو بچا ہے اس سے بھی ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔ اس لئے انصاف کا تقاضا ہے کہ اعلیٰ عدلیہ نامی گرامی شخصیات کے ساتھ ساتھ معمولی مقدمات میں بھی دلچسپی لے اور متعلقہ جج صاحبات کو بھی اپنی ذمہ داریوں پر پابند کرے۔ کیونکہ بڑے بڑے ہائی پروفائل کیس تو چند ایک ہی ہوتے ہیں جبکہ چھوٹے مقدمات، جو کہ صرف بڑوں کو چھوٹے نظر آتے ہیں وہ بہت زیادہ توجہ کے حقدار ہیں۔ ان پر توجہ دے کر عام سائلین تک انصاف کا حصول آسان، سستا اور فوری بنائیں جو کہ انصاف کی اصل روح ہے۔

طنز و تضحیک :

عام طور پر دورانِ گفتگو ایسے چبھتے الفاظ یا جملے بول دیئے جاتے ہیں جو تکلیف دہ ہونے کے باوجود اس لئے نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں کہ یہ منفی انداز معمول بن چکا ہے۔ جبکہ ان میں طنز و تضحیک بلکہ تذلیل کہیں چھپی تو کہیں ظاہری طور پر محسوس ہوتی ہے مثلاً کسی کو انتظار کرانا مقصود ہو تو کہا جاتا ہے صبر کریں۔، گویا اس میں صبر نہیں حالانکہ ایسے موقع پر کہنا چاہیے ذرا انتظار کریں یا ٹھہر جائیں، یا کسی کی لاعلمی پر کہنا کہ آپ تو پڑھے لکھے لگتے ہیں، آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔ جبکہ

ایسی بات کرنیوالا خود جاہل اور بے وقوف ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی عقل کل نہیں ہوتا، اس لئے کوئی جتنا بھی تعلیم یافتہ ہوگا اس کی زندگی کے تمام شعبوں پر دسترس نہیں ہوسکتی۔ جیسے بڑھئی، موچی یا مالی وغیرہ کو جو اپنے اپنے کاموں میں مہارت ہے وہ تعلیم یافتہ کو میسر نہیں ہوسکتی۔ اس لئے سرکاری یا غیر سرکاری اداروں میں کوئی ضرورت مند جائے تو جو معلومات متعلقہ اہلکاروں کو ہیں وہ سائل کو نہیں۔ اس لئے ایسے طنزیہ جملے کسنا بے مقصد اور بدتمیزی ہے۔ یا کسی کی پسندیدہ سبزی، پھل یا پکوان کے بارے میں کہنا کہ یہ کوئی کھانے والی چیز ہے۔ یہ نہ صرف طنز ہے بلکہ تکبر اور کفران نعمت ہے۔ یا کسی کے پسندیدہ کھیل پر کہنا کہ یہ بھی کوئی کھیل ہے یا لباس یا رنگت پر انگلی اٹھانا۔، یا یہ گاؤں یا شہر بھی رہنے کے لائق ہے۔ یا دوسرے کی بات کو رد کرتے ہوئے کہنا کیسی عجیب بات کر رہے ہو پاگل تو نہیں ہوگئے، یا خدا کا خوف کریں، یا کچھ احساس کریں، گویا دوسرے کو خوف خدا نہیں یا بے حس ہے۔ یا دو افراد گفتگو کر رہے ہوں تیسرے کی مداخلت پر یہ کہہ کر اسے بے وقعت کر دینا کہ آپس کی بات ہے یا بحث یا جھگڑے میں سمجھانے والے کو کہنا تمہیں کیا ہے۔ یا کسی کے گھر جائیں تو کہنا کتنا ٹھنڈا، اگر گرمی ہو تو کتنا گرم ہے آپ کیسے اس گھر میں رہتے ہیں یا محدود آمدنی والے گاڑی خریدیں یا بچے کو اعلیٰ تعلیمی ادارے میں داخلہ دلوائیں تو خوشی کے اظہار کی بجائے جلن چھپاتے ہوئے فکر انگیزی ظاہر کریں کہ اتنے اخراجات کے کیسے متحمل ہوں گے۔ یا بچوں بالخصوص بیٹی کا رشتہ اَپر کلاس میں ہو جائے تو ورطہ حیرت میں ڈوب کر طنزیہ انداز میں کہیں کہ اتنا اونچا ہاتھ کیسے مار لیا۔ گویا ان کو کمتر سمجھنا، یا بحث مباحثہ پر دوسرے کو الزام دینا کہ تم تو کبھی بات مانتے ہی نہیں جبکہ وہ خود بھی نہیں مان رہا ہوتا۔ یعنی جو عمل وہ خود کرے دوسرا ویسا ہی کرے تو برا سمجھے۔ اس کے برعکس اگر دوسروں کی خامیوں اور کمزوریوں کو طنز و تضحیک کا نشانہ بنانے کی بجائے اپنے گریبانوں میں جھانک کر ہم اپنی اصلاح کر لیں تو معاشرے میں

مثبت سوچ سے باہمی عزت واحترام اور محبت کا ماحول پروان چڑھے گا جو ہماری روایات کا غماز ہے۔

قومی زبان :

معاشرے کے بگاڑنے اور سنوارنے میں میڈیا کا کردار بہت اہم ہے۔ اگرچہ میڈیا نے ظلم و زیادتی، کرپشن اور جعلسازوں کو بے نقاب کیا ہے مگر اپنی قومی زبان کا تو گویا ستیاناس کر دیا ہے۔ اور ستم یہ ہے کہ غلطیوں کو سدھارنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی جاتی۔ حالانکہ چینلز کا اتنا ذمہ دارانہ معیار ہونا چاہیے کہ دیکھنے والے اپنی درستگی کریں نہ کہ عام لوگ جن کی باقاعدہ ذمہ داری نہیں وہ چینلز کی غلطیوں کی نشاندہی کریں۔ مثلاً اردو کے بہت اہم حرف ''ہ'' کو تو جیسے ختم کرنے کی ٹھان لی ہے۔ یعنی پیسہ کو پیسا، راستہ کو راستا، راجہ کو راجا، تھانہ کو تھانا، کمرہ کو کمرا۔ ان کے علاوہ لفظوں کی تبدیلی جیسے ''کی'' کی بجائے ''کری'' والی غلطی بالخصوص کراچی میں تو سمجھی ہی نہیں جاتی۔ یعنی میں نے خریداری کی ہے کی بجائے کہیں گے خریداری کری ہے۔ کوئی نشاندہی کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتا۔ البتہ ٹی وی پر ایک تقریری مقابلہ میں اقرار الحسن نے اسی غلطی پر ایک مقررہ کے نمبر کاٹ لئے تھے۔ بلکہ یہ تک کہہ دیا تھا کہ اس سلسلے میں باقاعدہ تصحیح پروگرام ہونے چاہئیں۔ اسی طرح دوسرے ذمہ دار بھی سنجیدگی سے اپنی قومی زبان کی بڑھتی لفظی و حرفی غلطیوں کا تدارک کر کے اصل شکل میں بحال کرنے کا قومی فریضہ انجام دیں تاکہ ہماری قومی زبان اصل شکل میں بحال ہو جو کہ حب الوطنی کا تقاضا اور ضرورت بھی ہے۔